ہندوستان کی نامور ہستیاں
حصہ دوم
پبلیکیشنز ڈویژن

ہندوستان کی نامور ہستیاں

(حصہ دوم)

پبلیکیشنز ڈویژن
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ
حکومت ہند

پوس شک سمت ۱۸۸۵
جنوری ۱۹۶۴ء

BNARAT KE GAURAV PT II (URDU)

قیمت:- دو روپے پچاس نئے پیسے

Rs. 2.50

پبلشرز:- ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پرنٹرز:- گپتا پرنٹنگ ورکس اسپلانڈ روڈ دہلی ۶

تمہید

پہلے حصے کے دیباچے میں بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کی تعمیر و ترقّی ایک مسلسل عمل ہے اور اس میں طرح طرح کے عناصر کام کرتے ہیں۔ یہ بتایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں کسی قوم کا مقابلہ فرد سے کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کسی فرد کے اوپر طرح طرح کے عوامل اثر انداز ہو کر اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں اسی طرح کسی قوم کی تعمیر میں طرح طرح کے واقعات، خیالات اور شخصیتیں بھی کئی طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ اثرات کبھی تو ایک قسم کے ہوتے ہیں، کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہونچاتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہوتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فرد یا خاص طور سے کوئی عظیم شخصیت ہی قوم کی تعمیر نہیں کرتی۔ قوم کی تعمیر تو بہت سے عناصر سے ہوتی ہے جس میں عظیم شخصیتیں بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس جلد میں ہم عہدِ قدیم سے زمانۂ وسطیٰ تک پہونچے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے ہندوستان کے سبھی حصّوں کے مہاپرشوں اور بڑے لوگوں کو اس کتاب میں جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ ان لوگوں کی زندگیوں سے پڑھنے والوں میں ایکتا، تیاگ اور پریم کی بھاؤنا پیدا ہوگی۔ یہ مہاپرش کسی ایک حصّے کے لئے نہیں بلکہ سارے دیش کے لئے مہان تھے۔ اس طرح علاقوں اور صوبوں کی حدود میں بند ہو کر سوچنے کے انداز سے بھی نجات ملے گی۔

ہندی کے زیادہ تر عام فہم الفاظ رہنے دئے گئے ہیں۔ مذہبی رسوم، تقریبات اور مذہبی اصطلاحوں کا اصل نام بھی رہنے دیا گیا ہے۔ عام طور سے متبادل الفاظ دے دئے گئے ہیں اور ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

مرتّب

ترتیب

رامانج

شنکر آچاریہ کے ۳۰۰ سال بعد گیارھویں صدی عیسوی میں رامانج آچاریہ کا جنم ہوا۔ شری شنکر آچاریہ گیان اور معرفت کے راستے پر چلنے والے تھے۔ رامانج آچاریہ بھگتی (عبادت) کے راستے پر۔ شنکر آچاریہ کی طرح ہی رامانج آچاریہ اپنے وقت کے بہت بڑے پنڈت مانے جاتے ہیں اور عالموں کی نظر میں اس زمانے کے ان ہی دو عظیم ہستیوں کو اہمیت حاصل ہے۔

رامانج آچاریہ کی جنم بھومی جنوبی ہند میں مدراس سے کچھ دُور پیرو گھوورم (پرانا نام بھرت پلی) نام کی ایک جگہ کہی جاتی ہے۔ ان کے پتا کا نام آسور کیشو دکشیت تھا۔ رامانج کی ماتا کانتی متی شری شیل پورن نام کے ایک سنیاسی کی بہن تھیں۔ وہ رشتے میں شری یمنا چاریہ کی نواسی بھی لگتی تھیں۔ جب رامانج آٹھ سال کے ہوئے تو جنیو کی رسم ادا کی گئی اور ان کے پتا نے اُس وقت سے اُنھیں پڑھانا شروع کر دیا۔ بچپن سے ہی رامانج اپنی ذہانت کا ثبوت دینے لگے۔ جس سبق کو وہ ایک بار پڑھ لیتے اُنھیں فوراً یاد ہو جاتا۔ سولہ سال کی عمر میں رامانج کا رکشامبا نام کی ایک برہمنی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ شادی کے تھوڑے ہی دن بعد رامانج کے پتا کی موت ہوگئی۔

والد کی موت کے بعد رامانج اپنے کنبے کے ساتھ اپنے گاؤں پیرو گھورم سے کانچی چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ ان دنوں کانچی تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ شمالی ہند میں جو مقام کاشی کو حاصل تھا وہی جنوبی ہند میں کانچی کو حاصل تھا۔ اس وقت کی کانچی کے پنڈتوں کے سردار یادو پرکاش مانے جاتے تھے۔ وہ شنکر آچاریہ کے گرو تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کو چھوڑ کر دُنیا میں جو بھی چیزیں ہیں وہ سب خیالی ہیں۔ انھیں یادو پرکاش سے رامانج وید اور اپنشد پڑھنے لگے۔ مگر کچھ ہی

دنوں بعد دونوں میں نظریاتی اختلاف شروع ہوگیا۔ پہلی بار تو گرو نے رامانج کی اس جسارت کو معاف کردیا پر دوسری دفعہ جب رامانج نے یادو پرکاش کی تقریر کو غلط بتایا تو گرو نے اُنھیں اپنے گھر واپس جانے کی اجازت دے دی۔ تبھی سے رامانج نے گرو سے پڑھنا بند کردیا اور وہ اپنے گھر پر ہی پڑھنے لگے۔

کانچی پورن سوامی سے رامانج کی ملاقات کی کہانی بڑی ہی دلچسپ ہے۔ کانچی پورن سوامی کے پتا شودر تھے اور ان کی ماتا شبری تھیں لیکن کانچی پورن سوامی شری ویشنو فرقے کے پہونچے ہوئے سنیاسیوں میں گنے جاتے تھے۔ کانچی پورن سوامی شری ویشنو فرقے کے مشہور مہنت یمنا آچاریہ کے پانچ خاص شاگردوں میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب رامانج پیر بوگھورم میں رہتے تھے تو ایک دن اتفاق سے کانچی پورن سوامی اس طرف سے گزرے۔ رامانج اُنھیں بڑی عزت سے اپنے گھر لے آئے۔ رات کے کھانے کے بعد کانچی پورن سوامی باہر برامدے میں لیٹے۔ جب رامانج نے ان کا پیر دبانا چاہا تو کانچی پورن نے انھیں روکا۔ اُنھوں نے کہا کہ میں تو نیچ ذات کا ہوں اور تم براہمن ہو۔ براہمن کو شودر کے پیر نہیں دبانے چاہئیں۔ یہ سُن کر رامانج بہت دُکھی ہوئے اور بولے میری قسمت ہی خراب ہے جس سے آپ جیسے مہاتماؤں کی سیوا کرنے کا مجھے موقع نہیں ملتا۔ جنیو پہن لینے سے کوئی برہمن نہیں ہو جاتا۔ ہری بھگت ہی سچے برہمن ہیں۔

کانچی پورن سوامی اس بات سے بڑے متاثر ہوئے اور تبھی سے ان دونوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور عقیدت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

رامانج کے علم و فضل کی شہرت روز بروز چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ یمنا آچاریہ چاہتے تھے کہ ان کے بعد رامانج ہی شری ویشنو فرقے کے مہنت ہوں۔ لیکن شری ویشنوؤں کے مہنتوں کو گدی پر وہی بیٹھا سکتا تھا جو شری ویشنو فرقے کا سنیاسی ہو۔ اس لئے شری رنگم سے یمنا چاریہ نے مہاپورن سوامی کو رامانج کو بُلانے کے لئے کانچی بھیجا۔ کانچی میں ہی مہاپورن سوامی نے رامانج کو شری ویشنو فرقے کی تعلیم دی۔

اس کے کچھ دن بعد رامانج یمنا آچاریہ کے درشنوں کے لئے شری رنگم کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن جب وہ شری رنگم پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ یمنا آچاریہ تو جنت کو سدھار گئے ہیں۔ انتقال سے پہلے یمنا آچاریہ رامانج کے لئے ایک پیغام چھوڑ گئے تھے۔ اس پیغام میں رامانج سے کہا گیا تھا کہ وہ تین باتیں ضرور کریں۔

(۱) ویدانت سوتروں کی تشریح کرنا (۲) دراوڑ بھاشا میں آلواروں کے بھجنوں کے سنگرہ (مجموعہ) کو وید کے نام سے مشہور کر کے اسے پنچم وید کی جگہ دینا اور (۳) وشنو پران کے مصنف منی شریشٹ پراشر کی یاد میں کسی مہا پنڈت وشنو کا پراشر نام رکھنا۔ رامانج شری رنگم ٹھہرے نہیں بلکہ فوراً کانچی لوٹ آئے۔

جس وقت رامانج کو بلانے کے لئے مہا پورن جی کانچی آئے تھے وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔ کانچی میں شری رامانج کے گھر پر ہی وہ مع اپنی اہلیہ چھ ماہ تک ٹھہرے۔ اس موقعہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رامانج نے ان کی مدد سے دراوڑ زبان میں آلواروں کے ۴۰۰۰ بھجنوں کے سنگرہ کا مطالعہ کیا۔

ایک دن مہا پورن جی کی پتنی اور رامانج کی پتنی ایک ساتھ پانی لانے کے لئے نکلیں۔ راستے میں دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے کا حال جب مہا پورن جی کو معلوم ہوا تو وہ اپنی بیوی کے ساتھ شری رنگم کے لئے روانہ ہو گئے۔ رامانج اس وقت بازار گئے ہوئے تھے۔ بازار سے لوٹنے پر جب رامانج کو اس جھگڑے کا حال معلوم ہوا تو وہ بڑے دُکھی ہوئے۔ اسی دن اپنی بیوی کو تو انھوں نے ان کے پتا کے گھر بھیج دیا اور خود سنیاسی ہو گئے۔

یمنا آچاریہ کے بعد شری ویشنو فرقے کا کوئی نیتا نہ رہ گیا تھا۔ اس لئے ان میں بڑا انتشار پھیل رہا تھا۔ ان سب کی خواہش ہوئی کہ رامانج ہی ان کے نیتا بنیں۔ انھیں شری رنگم سے کانچی بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا گیا۔ رامانج تو اب سنیاسی ہو ہی چکے تھے۔ اس لئے

اس بار انھوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور شری رنگم پہونچ گئے۔ یمنا اچاریہ کی گدی پر براجمان ہوئے۔ شری رنگم کی گدی پر جو مہنت بیٹھا تھا اسے شری رنگم میں شری رنگناتھ جی کے مندر کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔ رامانج نے بڑی خوشی سے اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ مندر کی جو کچھ آمدنی ہوتی وہ سب بھگوان کی پوجا سیوا میں خرچ کی جاتی تھی۔ رامانج اس میں سے ایک پیسہ بھی اپنے لئے نہ رکھتے تھے۔ اپنی خوراک کے لئے وہ ہر روز بھکشا میں دی گئی چیزیں قبول کرتے تھے۔

شری رنگم میں رہتے ہوئے اُنھیں یمنا اچاریہ کے بتائے ہوئے منتروں کے صحیح صحیح معنی یمنا اچاریہ کے شاگردوں سے معلوم ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک نہایت اہم واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ شری یمنا اچاریہ کے پانچ خاص شاگرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام گوشٹی پورن سوامی تھا۔ مہاپورن جی کے مشورے سے رامانج گوشٹی پورن جی سے شری یمنا اچاریہ کے سکھائے گئے رہس منتر کو جاننے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ منتر گوشٹی پورن جی ہی جانتے تھے۔ گوشٹی پورن نے اٹھارہ بار رامانج کی درخواست کو ٹال دیا۔ لیکن اُنیسویں بار ان کو رہس منتر کی تعلیم اس شرط پر دی کہ رامانج رہس منتر کسی نااہل یا ایسے غیرے آدمی کو نہ بتائیں گے۔

رہس منتر کی جانکاری کے بعد رامانج رنگناتھ جی کے مندر کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ ہی میں نرسنگھ سوامی جی کے مندر کا میلہ لگا ہوا تھا۔ اس میلے میں شری وشنو عقیدے کے لوگوں کی بہت بھیڑ تھی۔ بھیڑ کو دیکھ کر رامانج سے نہ رہا گیا اور وہ ایک اُونچی جگہ کھڑے ہو کر زور زور سے اس رہس منتر کو دہرانے لگے۔ جس کی تعلیم اسی دن گوشٹی پورن جی نے انھیں دی تھی۔ گوشٹی پُورن جی نے جب رامانج جی کی یہ کرتوت سنی تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ اور اپنے شاگردوں کو بھیج کر شری رامانج کو اپنے پاس بلایا۔ رامانج کے آنے پر ان میں اور گوشٹی پورن جی میں جو بات چیت ہوئی وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

گوشٹی پورن جی ـــــ "کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اُستاد کا حکم نہ ماننے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے"؟

رامانج ـــــ "معلوم ہے گوردیو! دس ہزار سال تک نرک میں رہنا پڑتا ہے"۔

گوشٹی پورن جی ـــــ "تب پھر تم نے میرے حکم کے خلاف یہ منتر سب کے سامنے بار بار کیوں دہرایا۔"

رامانج ـــــ بھگون، مجھ سے بہت بھاری بھول ہوئی ہے۔ مگر آپ نے مجھے بتایا تھا کہ جو لوگ اس منتر کو سُنیں گے وہ سب سورگ میں جائیں گے۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر میں اس لئے منتر دہرانے لگا کہ انھیں سورگ مل جائے چاہے مجھے ہی میں نرک میں جلوں۔ ایسا ہی مجھے مناسب معلوم ہوا۔ اس لئے میں نے ایسا کیا۔ حکم نہ ماننے کے لئے آپ مجھے جو کچھ سزا دینا چاہیں خوشی سے دیجئے میں اسے بھگتنے کے لئے تیار ہوں"

یہ سنتے ہی گوشٹی پورن جی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ انھوں نے رامانج کو گلے لگا کر کہا کہ آپ میرے اُستاد ہیں اور میں آپ کا شاگرد۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مرنے سے پہلے یمنا اچاریہ نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ رامانج سے کہنا کہ وہ میری تین نصیحتوں کو پورا کرے۔ جب رامانج کو ان کی خواہش کا علم ہوا تو اُسی وقت انھوں نے عہد کیا تھا کہ میں یمنا اچاریہ کی ان تینوں خواہشوں کو پورا کروں گا۔ رامانج نے جس حسن و خوبی سے اپنا عہد پورا کیا۔ اس کی کہانی آج بھی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اسی وعدے کے مطابق رامانج نے آلواروں کے دراوڑ بھاشا میں بھجنوں کے سنگرہ کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ یہ پانچواں وید ہے۔ اپنے شاگرد کُریش کے پتر کا نام پراشر بھٹ رکھا اور ویدانت سوتروں کی تشریح اپنی کتاب 'شری بھاشیہ' میں کی۔

رامانج نے اپنی کتاب 'شری بھاشیہ' میں شنکر اچاریہ کے عقائد پر کڑی تنقید

کی ہے اور وید اور اُپنشدوں کے منتروں کا صحیح مطلب لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ویدانت شبدوں میں نرا کار برہم (لاصفت ذات) کی پوجا کی تلقین کہیں نہیں کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ان سوتروں میں تو بھگوان کو ساہکار برہم (بہ صفت ہستی) ثابت کیا گیا ہے۔

"شری بھاشیہ" کے لکھنے کے بعد رامانج اپنے شاگردوں کے ساتھ دیش کی یاترا پر نکلے۔ بڑے شہروں میں اُنھوں نے کئی پنڈتوں سے مذہبی بحثیں کیں۔ وہ جہاں گئے اور جہاں بھی شاستر کے معانی و مطالب کے بارے میں پنڈتوں سے ان کی بحث ہوئی ہمیشہ ان کی جیت ہوئی۔ وہ اُتر میں کشمیر تک گئے۔ اور کاشی بھی گئے۔ کشمیر اور کاشی میں بھی شاستروں کے معانی و مطالب کے بارے میں پنڈتوں سے ان کی بحث ہوئی اور دونوں ہی جگہوں میں ان کی جیت کا ڈنکا بجا۔ کئی ہزار عورتوں اور مردوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اور کئی راجا مہاراجا ان کے چیلے بن گئے۔ اس طرح سارے ہندوستان کے پنڈتوں سے اپنی قابلیت کا سکہ منوا کر رامانج پیر بو گھورم ہوتے ہوئے شری رنگم لوٹ آئے۔

کانچی کا ایک چول راجا شیو بھگت تھا۔ اسے ویشنو دھرم کے اس بڑھتے ہوئے پرچار کو دیکھ کر بے حد غصہ آیا۔ اس نے شری رنگم میں رنگ جی کے مندر پر ایک جھنڈا ٹنگوا دیا جس میں لکھا تھا "شیوات پرو ناست" (شیو سے بڑھ کر کوئی نہیں) جو کوئی شیومت کی مخالفت کرتا اسی کی جان پر آبنتی۔ اس راجا نے ویشنو دھرم کے ماننے والوں پر بڑا ظلم کرنا شروع کر دیا۔ رامانج کو بھی اس نے دھوکے سے مار ڈالنے کے مقصد سے کانچی بلا بھیجا مگر رامانج کانچی نہیں گئے اور بارہ سال تک یعنی جب تک وہ ظالم راجہ زندہ رہا تب تک وہ میسور راجیہ میں واقع شال گرام نام کی جگہ پر رہ کر برابر ویشنو دھرم کی تبلیغ کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے یادو ادری (میلوکوٹ) کے مقام پر ایک مندر بنوایا۔ اس مندر میں بھگوان کی وہ مورتی قائم کی گئی جسے رامانج نے خواب دیکھنے کے بعد زمین سے کھود کر نکالا تھا۔

رامانج نے اپنی زندگی میں جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے "شری بھاشیہ" کا ذکر اُوپر

ہو چکا ہے اس کے علاوہ انھوں نے شری مت بھگوت گیتا کی تفسیر گیتا بھاشیہ لکھی۔ "ویدارتھ سنگرہ" نامی کتاب میں انھوں نے مایا واد پر تنقید کی ہے۔ اور "ویدانت دیپ" نام کی تصنیف میں اپنی مشہور کتاب 'شری بھاشیہ' کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اور 'ویدانت سار' نامی کتاب میں اپنے اصولوں کو آسان طریقے سے بیان کیا ہے۔

شنکر اچاریہ نے اس عقیدے کا پرچار کیا تھا کہ دنیا میں قائم اور دائم رہنے والی ہستی یا ذات صرف خدا کی ہے اور باقی جتنی نظر آتی ہیں اُن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ محض فرضی یا خیالی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شرتی (وید اور اُپنشد) سے بھی شنکر اچاریہ کے عقائد کی تائید نہیں ہوتی۔ شنکر اچاریہ کے عقیدے میں ایشور پریم اور اس کی سیوا کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

شنکر اچاریہ کا یہ عقیدہ ویشنوؤں کے عقیدے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے ویشنوؤں کی یہ زبردست خواہش تھی کہ جن اپنشدوں کے ذریعہ ثبوت فراہم کرکے شنکر اچاریہ نے ادویت مت کو قائم کیا ہے ان ہی کے ذریعہ اس مت کو غلط ثابت کیا جائے اور اس طرح ویشنو دھرم کی سچائی ثابت کی جائے۔ اسی لئے رامانج نے اپنی کتاب شری بھاشیہ کے ذریعے شنکر اچاریہ کے مت کی مخالفت اور ویشنو مت کی حمایت کی ہے۔

رامانج کا کہنا تھا کہ ایشور نرگن (لاصفت) نہیں۔ سگن (ہمہ صفت) ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی اوگن (عیب) نہیں وہ خالصوں میں بھی خالص ہے۔

شنکر کے مطابق دنیا مایا یا محض خواب و خیال ہے۔ رامانج کے مطابق دنیا کا بھی وجود ہے۔ جہاں شنکر اچاریہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ نجات کا ذریعہ گیان (علم) ہے وہاں رامانج نے مکتی کا ذریعہ بھگتی (ریاضت و عبادت) بتایا ہے۔ اس لئے شنکر گیان مارگی (گیان کے راستے پر چلنے والے) اور رامانج بھگتی مارگی (بھگتی کے راستے پر چلنے والے) کہلاتے ہیں۔

کلہن

گیارھویں صدی کے آخری حصے میں (۱۱۰۱ - ۱۰۸۹ء) کشمیر پر ہرش نام کے ایک راجا کی حکومت تھی۔ راجا ہرش نے گدی پر بیٹھنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ظلم کرنا شروع کر دیا۔ کشمیر کی رعایا نے ہرش کے ظلموں سے تنگ آکر بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت سات سال تک رہی۔ آخیر میں راجہ ہرش مارا گیا۔

اس کے دربار میں چمپک نام کا ایک برہمن وزیر تھا جو بڑا وفادار تھا اسی وزیر چمپک کے بیٹے کا نام کلہن تھا۔ راجہ کی موت کے وقت کلہن کم سن تھے۔ اس لئے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی پیدائش ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ ہوئی ۔۔ راجہ کی موت کے ساتھ ہی چمپک کا جیون بھی بدل گیا۔ وہ راج دربار کے کاموں سے الگ ہو گیا۔

کلہن کے پتا کی طرح اُن کے چچا کنک کی بھی راج دربار میں اچھی پہونچ تھی۔ کنک اچھے سنگیت کار تھے۔ مہاراج بھی ان پر بہت مہربان تھے۔ اُنھیں راجہ کی طرف سے انعام واکرام ملتا تھا۔ راج دربار کے عیش وعشرت میں پلے ہوئے کلہن کو پرانے زمانے کا بہت بڑا مورخ مانا جاتا ہے۔ کشمیر کی پرانی تاریخ سمجھنے میں 'راج ترنگنی' نام کی نظم (کاویہ) سے بہت مدد ملتی ہے۔ راج ترنگنی صحیح معنوں میں تاریخ ہے۔

بھارت کے پرانے شاعروں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے تھے وہ تاریخی واقعات کو بھی تخیلی طور سے پیش کرتے تھے جس سے اصلی تاریخ پر پردہ پڑ جاتا تھا۔ کلہن کے یہاں ہمیں یہ دونوں ہی باتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان کی کتاب سے ہمیں اس وقت کی تاریخ اور خود کلہن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔

کلہن نے کاویہ (نظم) کے رُوپ میں کشمیر کی تاریخ لکھ کر ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔

سنسکرت کے لفظ (ترنگ) کا مطلب ہے۔ لہر۔ 'راج ترنگنی' میں کلہن نے آٹھ ترنگوں میں کشمیر کے شاہی خاندانوں کے اُتار چڑھاؤ کا ذکر کیا ہے۔ وہ دھن دولت کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک شاعر ہونا زیادہ عزت کی بات تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ آرام سے ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں، جن کے پاس دھن اور عزت ہے، جن کے بڑے بڑے محلوں میں ہزاروں خوب صورت عورتیں رہتی ہیں وہ جب مر جاتے ہیں تو دُنیا ان کو بھول جاتی ہے۔ مگر شاعر ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ وہ دنیا کو راستہ دکھانے والا ہوتا ہے۔

ان ہی خوبیوں کی وجہ سے خودُ کلہن اور ان کی لکھی کشمیر کی تاریخ "راج ترنگنی" آج بھی مقبول ہے۔

کلہن کے پتا شیو کے بھگت تھے اور ہر سال بٹیشور جاتے تھے۔ کلہن بھی ان کے ساتھ جاتے تھے۔ پتا کے مذہبی خیالوں کی چھاپ ان پر بھی پڑی تھی۔ لیکن مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت جو قربانیاں دی جاتی تھیں وہ انھیں پسند نہیں تھیں۔ وہ بودھ دھرم کی بڑی عزت کرتے تھے اور اہنسا کے پجاری تھے۔

کلہن نے سخت محنت سے اپنی کتاب راج ترنگنی ایک سال میں ہی پوری کر ڈالی۔ لیکن اس کتاب کو لکھنے سے پہلے کلہن کو کافی مطالعہ کرنا پڑا۔ انھوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابیں جیسے کالیہ کی 'رگھو ونش' بان بھٹ کی "ہرش چرت" وِلہن کا 'ذکر مانک دیو چرت'، 'راماین'، مہابھارت اور دراہا مہر کی 'ورہت سنہیتا' وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ ان کے علاوہ انھوں نے آج کے مورخوں کی طرح پتھروں وغیرہ پر کندہ پرانے زمانے کی تحریروں کا بھی مطالعہ کر کے اپنی تاریخ کے لئے مسالہ اکٹھا کیا اور اپنی تاریخ میں استعمال کیا۔

براہمن خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے کلہن اس زمانے کے برہمنوں میں پیدا

ہو جانے والی خامیوں اور برائیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ برہمن اب پہلے جیسی محنت سے نہ تو پڑھتے ہیں اور نہ پڑھاتے ہیں وہ زیادہ مغرور ہو گئے ہیں اور حکومت کے کاموں میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتے ہیں اس لئے کلہن انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔

جواہر لال نہرو نے راج ترنگنی کے بارے میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ یہ کتاب تاریخ بھی ہے اور کویتا بھی۔ یہ کتاب آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں لگ بھگ ایک ہزار برسوں کی کہانی ہے۔ اور پہلے حصے کے مقابلے میں اس کا دوسرا حصہ زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔ اس میں راج محلوں کی سازشوں، قتل وخوں، دھوکا دہی لڑائی اور مظالم وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ راجاؤں کی کہانی ہے عام لوگوں کی نہیں۔ اس میں اس وقت کی سیاسی معاشی اور سماجی حالت کا نقشہ بالکل صحیح اور بڑی تفصیل کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتیں سبھا کی ممبر ہوتی تھیں اور بہادر سپاہیوں کی طرح لڑائی کے میدان میں جنگ کرتی تھیں۔

کلہن راج دربار کی اندرونی باتیں جانتے تھے۔ ان کے پتا نے ہرش کی موت کے بعد راج دربار سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔ اُن کے چاچا کنک بھی کاشی میں جا کر بس گئے تھے۔ کلہن کو سرکاری نوکری آسانی سے مل سکتی تھی۔ وہ چاہتے تو اُنہیں وزیر کا عہدہ بھی مل سکتا تھا۔ مگر انھوں نے سرکاری نوکری کے لئے کبھی کوئی کوشش نہ کی۔ وہ تو ادب کے شیدائی تھے اور اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں گذارتے تھے۔

کلہن نے کشمیر کی تاریخ اتنے دلچسپ طریقے سے لکھی کہ اس میں ناول کا لطف ملتا ہے۔ انھوں نے کشمیر کے ہر راجہ کے دورِ حکومت کے واقعات کا بڑا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔ کہیں کہیں سچی مگر چبھنے والی باتیں بھی کہی ہیں۔ جیسے — جس نے بھوک سے بلکتے اپنے پیارے بیٹے کو، دوسرے کے گھر نوکری کرنے والی اپنی بیوی کو، دکھ اور

تکلیف جھیلتے ہوئے اپنے دوست کو، چارہ نہ ملنے کی وجہ سے اپنی بھوکی گائے کو، دوا نہ ملنے کی وجہ سے بستر علالت پر پڑے ہوئے والدین کو اور دشمن سے ہارے ہوئے آقا کو دیکھ کیا وہ دوزخ (نرک) میں اس سے زیادہ اور کیا دیکھے گا؟

کلہن کا جنم امیر گھرانے میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بُرے دن نہیں دیکھے تھے۔ وہ حاجت مند نہیں تھے شاید اسی لئے انھیں دولت کا لالچ کبھی نہیں ہوا۔ اسی سے ان کی کتاب میں بھی غریب عوام کے دُکھوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اُنھوں نے راجہ مہاراجاؤں کے بارے ہی میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں تاریخ اسی طرح لکھی جاتی تھی۔ راجہ ہی سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا اور وہی سارے واقعات کا مرکز ہوتا تھا۔ مہابھارت میں بھی لکھا ہے "راجہ کالسیہ کارنم" ــــ راجہ زمانے کو بنانے والا ہوتا ہے۔ کلہن سے پہلے کشمیر کی اگیارہ تاریخیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان تاریخوں کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی تاریخ آج نہیں ملتی۔ کلہن کی کتاب کی اہمیت اسی لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

کلہن نے راجہ ہرش کی موت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جس وقت ہرش کو قتل کیا گیا اس وقت مکت نام کا ایک وفادار نوکر اس کے ساتھ تھا۔ اپنے مالک کی موت کے بعد وہ کسی طرح دُشمن کے چنگل سے بچ نکلا۔ اُسی نے راجہ کے قتل کا سارا حال کلہن کو بتایا تھا۔

کلہن نے اپنے چاچا کنک کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کاشی میں رہتے تھے مگر ان کی جائے پیدائش پریہاس پور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلہن کے والد پریہاس پور میں رہتے تھے اور وہیں شاید کلہن کا بھی جنم ہوا ہوگا۔

رامائن میں ہم پڑھتے ہیں کہ پرلوک سدھارنے سے پہلے رام نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو بلا کر اپنا راج ان میں بانٹ دیا تھا۔ اس بٹوارے میں اُنھوں نے اپنے دونوں بیٹوں لو اور کُش کو کشمیر میں لوپوری اور کش کا راج دیا تھا۔ کلہن نے کشمیر کے

راجاؤں کے بیان میں ان دونوں راجاؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔

کلہن کی ذاتی زندگی کی بہت کم باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ان کے بارے میں اب کافی چھان بین کی جا رہی ہے۔ بہر حال کشمیر کے مؤرخ کے رُوپ میں ادب کا یہ امر پُجاری ہمیشہ اپنی روشنی پھیلاتا رہے گا۔

جے دیو

سنسکرت دُنیا کی عظیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ آج ہمارے ملک میں سنسکرت بولنے والوں کی تعداد کم ہے مگر کسی زمانے میں سنسکرت ہی شرفاء کے لکھنے پڑھنے کی زبان تھی۔ جے دیو اس زبان کے عظیم شاعر ہوئے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایک ہی کاویہ (نظم) لکھا۔ اس کا نام ہے "گیت گووند" اپنے اسی ایک کارنامے ہی سے وہ امر ہو گئے۔ صرف ایک ہی تصنیف کی بدولت اتنی زیادہ شہرت پانے والے شاعر سنسکرت میں تو کیا دُنیا کی دُوسری زبانوں میں بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ گیت گووند کاویہ کیا ہے امرت کی دھارا ہے۔

جے دیو کا جنم بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں کیندوبلوؔ میں ہؤا تھا۔ یہ گاؤں پچھمی بنگال کے بیر بھوم ضلع میں ہے۔ جے دیو کا جنم کس سال ہؤا یہ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جنم بارھویں صدی میں ہؤا تھا۔ ان دنوں بنگال میں سین خاندان کے راجہ لکشمن سنگھ راج کرتے تھے اور دلی کی گدی پر چوہان خاندان کا راجہ راج کرتا تھا۔

جے دیو کے پتا کا نام بھوج دیو اور ماتا کا نام رام دیوی تھا۔ جب جے دیو بہت چھوٹے تھے تب ہی ان کے والدین کی موت ہو گئی تھی۔ اسی طرح وہ بچپن میں ہی ماں باپ کا پیار ان سے چھن گیا۔ اس کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا ہوگا۔

ان کے بچپن کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں معلوم ہیں۔ ان کی شادی کے بارے میں بھی بس اتنا معلوم ہے کہ ان کی شادی پدماوتی نام کی ایک لڑکی سے ہوئی۔ جے دیو کی شادی کی کہانی بڑی ہی دل چسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ پدماوتی کے والد نے ایک دن خواب دیکھا

خواب میں بھگوان جگن ناتھ نے ان سے کہا کہ پدماوتی کی شادی جے دیو سے کردو۔ اس کے بعد پدماوتی کے والد نے پوری میں ایک درخت کے نیچے اپنی بیٹی کا ہاتھ جے دیو کے ہاتھوں میں دے دیا۔

پدماوتی مذہبی خیالات کی تھیں۔ اس لئے دونوں کی شادی بڑی کامیاب ثابت ہوئی وہ بڑے پریم سے رہتے تھے۔ دونوں میں اس قدر محبت تھی کہ ایک پل کے لئے بھی ایک دوسرے کی جدائی گوارہ نہ تھی۔ پدماوتی نے جے دیو کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اپنی شاعری میں جے دیو کو پدماوتی سے بڑی مدد ملی۔

کچھ دنوں کے بعد جے دیو برج میں ورندابن اور آس پاس کی دوسری جگہیں دیکھنے گئے۔ ورنداابن میں کرشن کا بچپن گذرا تھا۔ یہیں پر کرشن گوپیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور یہیں پر کرشن کا رادھا سے پریم ہوا تھا۔ بڑے ہو کر کرشن ورنداابن سے متھرا اور پھر وہاں سے دوارکا چلے گئے تھے۔ گیت گووند میں جے دیو نے کرشن کی رنگ رلیوں کا دلچسپ حال لکھا ہے۔ ورنداابن، جمنا، وہاں کے درخت اور بیل بوٹے اور کنج گلیوں کو دیکھ کر جے دیو اپنی سُدھ بُدھ بھول گئے تھے۔ ورنداابن کے یہی دل فریب نظارے بعد میں ان کی تصنیف "گیت گووند" میں اپنی پوری دل کشی اور رعنائی کے ساتھ نظم ہو گئے ہیں۔

بنگال واپس آنے کے بعد جے دیو نے بنگال کے راج دربار کو رونق بخشی۔ وہ راج دربار کے پانچ رتنوں میں سے ایک تھے۔ راجہ اور رانی دونوں ہی ان کی بڑی عزت کرتے تھے لیکن ایک بار جب جے دیو باہر گئے ہوئے تھے تو رانی کو ایک مذاق سوجھا۔ انھوں نے پدماوتی سے کہا کہ جے دیو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ پدماوتی جے دیو کو بے حد چاہتی تھی۔ اس خبر سے اُسے اتنا دکھ ہوا کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

واپس آنے کے بعد جب جے دیو کو سارا حال معلوم ہوا تو ان کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ راجہ کے یہاں نہیں رہیں گے۔ وہ راج دربار چھوڑ کر اپنے

گاؤں میں جابسے۔ اور اپنی زندگی کے باقی دن اسی گاؤں میں اکیلے گزار دئے۔ ان کی موت کے بعد کندو بلو میں کئی صدیوں تک ان کے جنم دن کے موقع پر ہر سال جشن منایا جاتا تھا۔ اس جشن میں رات کے وقت جے دیو کے لکھے ہوئے گیت بڑی عقیدت سے گائے جاتے تھے۔

جے دیو نے اپنی مایۂ ناز کتاب 'گیت گووند' پوری میں لکھی تھی۔ اس میں رادھا اور کرشن کے پریم کہانی گیتوں میں بیان کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ 'گیت گووند' جیسا پریم کاویہ (عشقیہ نظم) بھارت کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ راج دربار اور مندروں میں لوگ گیت گووند کے اشعار عقیدت سے گاتے ہیں۔

گیت گووند میں صرف تین کردار ہیں۔ رادھا، کرشن، اور رادھا کی ایک سہیلی جو رادھا کا پیغام کرشن کے پاس اور کرشن کا پیغام رادھا کے پاس لاتی اور لے جاتی ہے۔ کرشن جب رادھا سے الگ ہو جاتے ہیں یا جب رادھا کرشن سے روٹھ جاتی ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے بغیر تڑپنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کی جدائی میں بے چین رہتے ہیں۔ لیکن دونوں ظاہری طور پر یہ دکھاتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کی پروا نہیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ ایکدوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسی صورت میں رادھا کی وہ سکھی دونوں کے دل کی باتیں ایکدوسرے کے پاس پہونچا دیتی ہے۔

رادھا اور کرشن کی اس پریم کہانی کو شاعر نے بڑے ہی سندر ڈھنگ سے لکھا ہے۔ گیت گووند کا پہلا ہی بند ہے کہ کرشن دن بھر رادھا اور گوپیوں کے ساتھ کھیلتے اور اودھم مچاتے رہے۔ شام ہوئی تو گھر جانے کا وقت آیا۔ کرشن کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کرشن کو اکیلے بھیجنا ٹھیک نہیں تھا۔ رادھا کرشن کے ساتھ ہولی۔ جمنا کے کنارے پر سنسان راستے سے پھولوں اور پھلوں کے کنج کے بیچ ہوتے ہوئے رادھا اور کرشن اکیلے جا رہے تھے وہیں پریم کی گرہ پڑ گئی۔

اس کے بعد شاعر نے راس کا ذکر کیا ہے۔ دوسری گوپیوں کے ساتھ کرشن کو ناچتے

دیکھ کر رادھا کو جلن ہوتی ہے۔ رادھا روٹھ جاتی ہیں اور رنجیدہ ہو کر پاس کے ایک کنج میں چلی جاتی ہیں۔ پیچھے پیچھے رادھا کی پیاری سکھی وہاں پہونچتی ہے۔ رادھا اس سے اپنے دل کا حال بتاتی ہیں ـــــ میں کرشن سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہوں۔

ادھر رادھا کو گوپیوں کے بیچ میں نہ پاکر کرشن بے چین ہو جاتے ہیں۔ راس میں ان کا دل نہیں لگتا۔ اکیلے کنج میں بیٹھ کر کرشن پچھتاتے ہیں کہ میں نے کیوں رادھا کو ناراض کر دیا۔ اس وقت رادھا کی سکھی دونوں کے من کا حال ایک دوسرے کو بتاتی ہے۔ رادھا بھی میرے لئے بے چین ہے ـــــ یہ جان کر کرشن کو خوشی ہوتی ہے۔ اور آخر میں دونوں کا ملن ہوتا ہے۔

کرشن اور رادھا کے جس پریم کی تصویر جے دیو نے گیت گووند میں کھینچی ہے وہ مجازی نہیں حقیقی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے جس وقت کا حال لکھا ہے اس وقت کرشن صرف آٹھ سال کے تھے۔ ان کی بنسری کی دھن پر کھنچ کر آنے والی برج کی گوپیاں عام عورتیں نہیں تھیں ان میں عجیب پاگل پن تھا۔ کرشن کے پریم میں وہ اتنی ڈوبی ہوئی تھیں کہ وہ چاہے جس لباس میں ہوں اور چاہے جہاں ہوں اپنا کام کاج چھوڑ کر اور سدھ بدھ بھول کر بنسری کی آواز کے پیچھے چل دیتی تھیں۔ جے دیو نے گیت گووند میں جس کرشن بھگتی کی دھارا بہائی تھی اس نے بعد میں کتنے ہی شاعروں کو متاثر کیا۔ ان میں ودیا پتی اور چنڈی داس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ودیا پتی پر جے دیو کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ راجہ شیو سنگھ نے جن کے دربار میں ودیا پتی رہتے تھے، انھیں "ابھی نو جے دیو" کا خطاب دیا تھا۔ ویسے تو جے دیو کے گیت گووند کے اشعار سارے بھارت میں مشہور ہوئے مگر دکھنی بھارت میں خاص طور سے ان کی شہرت ہوئی اور وہاں آج بھی لوگ انھیں بڑے چاؤ سے گاتے ہیں۔

گیت گووند کے شعروں میں جادو کا سا اثر ہے۔ اس بارے میں ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے ـــ صبح کا وقت تھا سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ بسنت کی ہوا میں آم کے بور کی خوشبو تھی۔ چیتنیہ مہاپربھو ان دنوں پوری میں زندگی کے آخری دن گذار رہے تھے۔ وہ

آہستہ آہستہ جگن ناتھ جی کے مندر کی طرف چلے جا رہے تھے کہ اُسی وقت ان کے کانوں نے ایک مدُھر گیت سُنا۔ یہ گیت جے دیو کا تھا ——

للت لونگ لتا پری شیلن، کومل ملے سمیرے

گیت گایا جاتا رہا اور چیتنیہ مہاپربھو مست ہو کر سنتے رہے۔ وہ گیت میں اتنے کھو گئے کہ جس طرف سے گیت کی آواز آرہی تھی وہ اُسی طرف بھاگنے لگے۔ وہ بھاگ کر گانے والے سے لپٹنا ہی چاہتے تھے کہ لوگوں نے اُنھیں الگ کھینچ لیا۔ گانے والی دیوداسی تھی۔ اور چیتنیہ سنیاسی۔ بھلا سنیاسی دیوداسی کو کیسے چھُو سکتا تھا۔

جے دیو نے صرف شاعروں اور سنتوں ہی کو متاثر نہیں کیا، مصوّروں (چترکار) پر بھی ان کے گیت گووند کا اثر پڑا ہے۔ پوری سے بہُت دُور بھارت کے دُوسرے کنارے پر جموّں اور کانگڑہ کی وادیوں میں مصوّروں نے گیت گووند کے اشعار پر مبنی تصویریں بنائیں۔ یہ تصویریں بہُت ہی خوبصُورت ہیں۔ اُنھیں بسولی اسکول کی تصویریں کہتے ہیں۔ بسولی پنجاب کی پہاڑی ریاست میں ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ وہاں کی رانی مالنی کو تصویروں کا بڑا شوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تصویریں اُسی کی فرمائش پر بنائی گئی تھیں۔

گیت گووند کاویہ ہے۔ لیکن اس میں ناٹک کی خوبیاں بھی ہیں۔ گیت گووند کو بھارتیوں نے ہی نہیں غیر ملکیوں نے بھی بہُت پسند کیا ہے اور بہُت سی غیر ملکی زبانوں میں اس کا منظوم ترجمہ ہُوا ہے۔ ان میں لاطینی، انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی زبانیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

بسو

بس ویشور یا بسو آرادھیہ فرقے کے پیرو مادیراج نام کے ایک قابل برہمن کے بیٹے تھے۔ اُن کی ماں کا نام مادلامبے تھا۔ ان کا جنم میسور راجیہ کے بیجاپور ضلع کے باگھواڑی نام کے گاؤں میں ہوا تھا۔ ان کے ماموں بلدیو کلیان کے راجہ بجّل رائے (۱۱۵۷ء-۱۱۶۷) کے وزیر تھے۔ بسو اپنے گاؤں باگھواڑی سے وہیں پہنچ گئے تھے اور انھیں کی نگرانی میں اُنھوں نے حکومت کا کام سیکھا۔ جب بلدیو کی موت ہوگئی تو حکومت کے کاموں میں بسو کی مہارت اور قابلیت سے متاثر ہو کر بجّل رائے نے انھیں اپنا وزیر بنایا۔ بجّل کی بہن کا راجہ سے بیاہ ہونے کی وجہ سے یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

بسو بڑے مذہبی خیالات کے آدمی تھے۔ جو وقت حکومت کے کاموں سے بچتا اسے سادھوؤں کی سیوا میں صرف کرتے۔ حکومت کا خزانہ ان کے قبضے میں تھا اس کا بہت روپیہ شیو کو ماننے والے سادھوؤں پر خرچ کرتے۔ لیکن اس سے خزانہ میں کوئی خاص کمی نہ آئی۔ مگر بسو کے دشمنوں نے راجہ کے کان بھرنے شروع کر دئے۔ آہستہ آہستہ راجہ کا دل اُن کی طرف سے پھر گیا اور جو اُس کا دوست تھا وہی دشمن نظر آنے لگا۔ راجہ نے بسو کو گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ کلیان سے صاف بچ کر نکل گئے۔ اس نے بسو کو پکڑنے کے لئے کچھ آدمی بھیجے مگر بسو نے انھیں آسانی سے ہرا دیا۔ تو راجہ خود ایک بڑی فوج لے کر اس مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ مگر بسو کی ہوشیاری اور اہلیت و قابلیت سے عوام اس کی طرف ہو چکے تھے۔ بجّل کی لڑائی میں ہار ہوئی۔ تھوڑے دنوں بعد وہ بسو کو منا کر کلیان واپس لے آیا اور وہ پھر شو بھگتوں کی خدمت کرنے لگے اور ہر طرح سے انھوں نے ویرشیو مت کی جڑیں مضبوط کیں۔

تاریخ کے کچھ ماہر بسو کو ویرشیو فرقے کا بانی مانتے ہیں مگر ویرشیو دھرم کی روایات ویرشیو دھرم کو بہت پرانا مانتی ہیں۔ بسو صرف اس کے زبردست حامی تھے۔ بسو پوران میں لکھا ہے کہ ایک بار نارد رشی بھگوان شو کے پاس پہنچے اور کہنے لگے دنیا میں مختلف عقیدے اور فرقے ہیں۔ وشنو بھگت، بودھ، جین سبھی ہیں مگر شو کے پجاری کہیں نہیں ہیں۔ پہلے زمانے میں وشویشورادھیہ، پنڈتارادھیہ، اکورام وغیرہ نے شو بھگتی کی بنیاد ڈالی تھی مگر اس وقت ایسا کوئی گرو موجود نہیں۔ اس پر بھگوان شو نے زمین پر اوتار لے کر نندی کو ویرشیو کے اصولوں کو پھیلانے کا حکم دیا۔

یہ روایت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ غالباً ویرشیو کے اصولوں کی اشاعت بسو کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مگر اسے کسی اچھے حمایتی کی ضرورت تھی۔ کرناٹک پردیش کے آس پاس جینیوں کا کافی اثر تھا۔ ویشنوؤں کی تعداد بھی کافی ہوگی۔ شیو فرقے کے لوگ بھی تھے مگر ان میں سبھی مختلف دیوی دیوتاؤں کو ماننے والے تھے۔ ایسے شیو کم تھے جو صرف شیو کی بھگتی میں ہی یقین رکھتے ہوں۔

صرف شیو کی بھگتی میں یقین رکھنے والے شیوؤں یعنی بسو کے ماننے والے ویرشیوؤں کے اصول اور خیالات دوسروں سے کچھ مختلف تھے۔ شیو سچدآنند ہیں۔ ان کا تعریفی نام "استھل" ہے۔ اپنی قوت کے بھروسے پر یہی "استھل" دو صورتیں اختیار کر لیتا ہے —— "لنگ استھل" اور "انگ استھل"۔ لنگ استھل کے بھگوان شیو ہیں۔ "انگ استھل" جیو ہے۔ اسی طرح سے طاقت کی بھی دو شکلیں ہیں۔ ویرشیو مت کے فلسفیانہ خیالات کی تشریح شری پتی نے برہم سوتر پر "سری بھاش" لکھ کر کیا ہے۔ ان کا منتر "اوم نمو شیوائے" ہے۔ اپنی پوجا کی جگہ "لنگ" لگاتے ہیں اس وجہ سے وہ ویرشیو لنگ مت کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ عورت اور مرد دونوں اس فرقے کے پیرو ہو سکتے ہیں۔

ویرشیو مت کے مختلف فلسفیانہ خیالات اور اصول شاید بسو کے وقت سے پہلے بھی

موجود رہے ہیں۔ بسونے ویرشیو دھرم کو مضبوط اور زیادہ پھیلانے کے لئے حکمت عملی کے اعتبار سے ان کچھ تبدیلیاں کی ہوں گی۔ اگر ان تبدیلیوں کا مقابلہ ہم سکھ دھرم کے تبدیلیوں سے کریں تو نامناسب نہ ہوگا۔ گرو نانک دیو نے جن اپدیشوں سے عوام کو مخاطب کیا وہ اس کے پران ہیں۔ ہر ایک سکھ کے لئے وہ اب بھی قابل احترام ہیں مگر دسویں گرو گوبند سنگھ نے کچھ تبدیلیاں کرکے اس کی شکل ہی بدل دی اور اُسے ایک نئی صورت دی۔ بسو کا کام غالباً کچھ ایسا ہی تھا۔

اس وقت کے لنگایت مورتی کے پجاری نہیں ہیں۔ ان کے لئے لنگ قابل پرستش ہے اور گرو بھی۔ مندروں میں جانا ان کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ان کے سب سے زیادہ قابل احترام پانچ مٹھ ہیں جو ان کے پُرانے آچاریوں سے متعلق ہیں۔ ایکورام کا مٹھ ہماچل پردیش کے کیدارناتھ میں، پنڈت ارادھ کا سری شیل میں، ریون کا بالیہل میں، مرول کا بلاری پردیش میں اوجینی نام کے استھان پر اور وشو ارادھ کا کاشی میں ہے۔ تقریباً ایسے ہر قصبے میں جہاں لنگایتوں کی آبادی ہے ان کا ایک مٹھ ہے اور ان کا تعلق ان میں سے کسی نہ کسی مٹھ سے رہتا ہے۔ لنگایت دو حصوں میں منقسم ہیں۔ — جنگم اور ان کے پیرو دوسرے لنگایت۔ جنگموں کے پھر دو فرقے ہیں — ورکت جنگم۔ برہم چرج کے قائل ہیں اور مٹھوں میں رہتے ہیں۔ اور گرہست جنگم پوجا پاٹھ کا کام کرتے ہیں۔ لنگایت گوشت وغیرہ نہیں کھاتے۔ وہ شراب نہیں پیتے۔ بیواؤں کی شادی ہوتی ہے۔ بچپن کی شادی منع ہے۔ ان کے مطابق ایک ہی جنم میں نجات پانا ممکن ہے۔ یہ ذات پات میں یقین نہیں کرتے۔

ان میں سے کتنے اصول اور قاعدے بسو کے بنائے ہوئے ہیں یہ بتانا مشکل ہے۔ مگر بہت سے عالموں کا اندازہ ہے کہ بسو نے مختلف پہلوؤں سے لنگایت دھرم کو برہمن دھرم سے مختلف بنانے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ عورتوں کو کئی حقوق بسو کی مہربانی سے ملے ہوں۔ برہمن، جین وغیرہ مذہب کے ماننے والوں نے کئی اعتراضات کئے تھے۔ انھیں

ناپاک مانا تھا۔ لنگایت مت میں عورتوں کو وہی حق حاصل ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں وہ اتنی ہی پاک ہیں۔ عورتوں کو ویرشیو دھرم میں شامل کرنے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ شودر، ویش وغیرہ سب ذاتوں کے لئے اب مکتی (نجات) کا راستہ کھلا تھا اور ہر ایک کو شیو منتر سے دیکشت ہو کر مکتی پانے کا حق حاصل تھا۔ ذات پات کی بندشوں سے جکڑا ہوا برہمن دھرم، جین دھرم کا سامنا نہ کر سکا تھا مگر ویرشیو دھرم کے مقابلہ میں جین دھرم کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ ویرشیو نہ گوشت کھاتے ہیں اور نہ شراب پیتے ہیں۔ اس لئے جینیوں نے ویرشیو مذہب اختیار کر لینا مشکل نہ تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ بسو نے جینوں کے خلاف طاقت کا استعمال بھی کیا تھا۔ مستقبل میں بھی لنگایتوں کا شیرازہ نہ بکھرے اور ان میں استحکام پیدا ہو اس لئے سب لنگایتوں کا بھارت کے مختلف مٹھوں سے تعلق پیدا کر دیا گیا یہ بھی شاید بسو کی دین ہو۔ ایک انگریز عالم کا خیال ہے کہ بسو نے مٹھوں کے ذریعے سماج کی تنظیم کا طریقہ جینوں سے لیا تھا مگر اصل میں یہ ملک کی پرانی روایت تھی۔ شکت فرقے کی تنظیم کئی شاکت پیٹھ کر رہے تھے۔ ادویت مت کی تبلیغ اور تنظیم وغیرہ کے لئے شری شنکر آچاریہ نے بھارت کے چاروں کونے میں مٹھ قائم کئے تھے۔ بسو کے سامنے شنکر آچاریہ کی مثال تھی۔ بسو نے ایک نئے سماج کی ہی تنظیم نہیں کی بلکہ انھوں نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ ویرشیو مت کے پیرووں کے لئے ساری چیزیں موجود ہوں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

بسو بات کے دھنی اور بڑے باعمل انسان تھے۔ انھوں نے اپنے وقت کی ضروریات کو سمجھا اور انھیں پورا کرنے کے طریقے تلاش کئے۔ کسی حد تک ان کے خیالات کو انقلابی کہا جا سکتا ہے۔ بسو نے ذات پات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہندو جاتی کو اس سے چھڑانے کی کوشش کی۔ انھوں نے یہ بھی تعلیم دی کہ ایشور ایک ہے اور کوئی مورتی اس کی ہم شکل نہیں ہے۔ عورتوں کو انھوں نے سماج میں حقوق دیئے اور خود برہمن ہوتے ہوتے بھی انھوں نے براہمنوں کے خاص حقوق پر چوٹ کی۔ لنگایت مت کی موجودہ حالت اسی بات کا ثبوت

ہے کہ بسو نے اپنے سماج کے تعمیر کے کام کے لئے مضبوط بنیاد رکھی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ بسو سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ انھوں نے کچھ ایسے کام بھی کئے ہوں جنھیں ہم مناسب نہ کہہ سکیں۔ مگر ان کے تخلیقی کاموں کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسی لئے ہندوستان کے عظیم مذہبی رہنماؤں میں بسو کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

بسو کے قول سارے کرناٹک میں بہت مشہور اور ہر دل عزیز ہیں۔ سبھی ذات اور دھرم کے لوگ ان کے اقوال کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے اصولوں اور آدرشوں کے پرچار کے لئے بسو نے بڑی آسان کنڑ زبان کا استعمال کیا۔ آہستہ آہستہ بسو کے اقوال اتنے مشہور ہوئے کہ کنڑ زبان کے ادب میں ان کو ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا۔ اگرچہ بسو نے اپنی زندگی روحانی ترقی میں صرف کردی پھر بھی سماجی اور معاشی پہلوؤں کے متعلق انھوں نے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ بھی بہت حد تک انقلابی تھے۔ انھوں نے ذات پات کے بھید بھاؤ کو مٹایا، ایشور کی نظروں میں سب کو برابر ٹھہرایا اور عورتوں کو سماج میں اونچی جگہ دلائی۔

بسو کے کچھ بچن اس طرح ہیں :-

چراؤ نہیں، مارو نہیں، جھوٹ مت بولو، مخالفوں کو ذلیل مت کرو اور کسی سے حسد بھی مت کرو۔

اے ایشور! مجھے لنگڑا کردو تاکہ میں چل پھر نہ سکوں۔ مجھے اندھا کردو کہ میں ادھر ادھر دیکھ نہ سکوں، مجھے بہرا کردو کہ میں کچھ سُن نہ سکوں۔ یہ سب اس لئے کرو تاکہ میں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر تمھاری پوجا کروں۔

کمبن

آپ گوسوامی تلسی داس کے بارے میں سن چکے ہوں گے۔ گوسوامی تلسی داس نے ہندی میں راماین لکھی تھی۔ دکھنی بھارت میں بھی کمبن نام کے ایک کوی ہوئے ہیں جنھوں نے تامل زبان میں راماین لکھی ہے۔

کمبن کی پیدائش جنوبی ہند کے تامل ناڈ کے چول راجیہ میں ترو ولندور نامی گاؤں میں ہوئی۔ کمبن کا زمانہ بارھویں صدی کا مانا جاتا ہے۔ کچھ عالم یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ نویں صدی میں گذرے ہیں۔

کمبن کی زندگی کے بارے میں کوئی خاص باتیں معلوم نہیں ہوئیں۔ ان کا اصلی نام کیا تھا۔ یہ بھی ابھی تک نہیں معلوم ہوا۔ کمبن ان کا تخلص تھا۔ ان کے والدین بچپن ہی میں پرلوک سدھار گئے تھے اور کم سن کمبن اناتھ ہو گئے۔ کمبن کے رشتے داروں میں اس کم سن بچے کی پرورش کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ ان کے ایک رشتہ دار دن لوڈ کمبن کو سڈیپ ولّل کے مکان کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ تر دینو نلّور کے رہنے والے تھے۔ (یہ جگہ دکھنی بھارت میں جنوبی ارکاٹ ضلع میں ہے)

سڈیپ ولّل بڑے فیاض آدمی تھے۔ وہ اچھے اور امیر کسان تھے۔ ان کے دادا پردادا پانڈی چری بندرگاہ کے راستے سے تجارت کیا کرتے تھے۔

جب سڈیپ ولّل اپنے مکان کے باہر آئے تو کم سن کمبن کو اپنے دروازے کے پاس کھڑا پایا۔ سڈیپ ولّل کمبن کا ہاتھ پکڑ کر فوراً ہی اندر لے گئے۔ اس دن سے وہ ان کے گھر میں ہی رہنے لگے۔ وہ ان کے بیٹوں کے ہمراہ آیا جایا کرتے اور ان کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔

دلّی کے بیٹوں کے ساتھ ساتھ کمبن بھی پڑھنے لکھنے لگے۔ بچپن سے ہی وہ پڑھنے لکھنے میں تیز تھے۔ کمبن کے شوق کو دیکھ کر دلّی اپنے بچّوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی پڑھانے لگے۔ چند برسوں کے بعد کمبن پڑھ لکھ کر عالم بن گئے۔ وہ شاعری بھی کرنے لگے تھے۔ ان کی شاعری سے متاثر ہو کر سڈّیپ دلّی ان کو اپنے برابر بٹھانے لگے۔

سڈّیپ دلّی دکھنی بھارت کے ان دنوں کے چول راجہ کے دربار میں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ کمبن بھی ان کے ساتھ راج دربار میں جاتے تھے۔ ایک دن چول راجہ نے کمبن کی شاعری سے متاثر ہو کر ان کو اپنا راج کوی بنا دیا۔ اسی دن سے وہ چول راجہ کے دربار میں وہ کر اچھی اچھّی نظمیں کہنے لگے اور دربار کی رونق بڑھانے لگے۔

کمبن کی شاعری سے متاثر ہو کر چول راجہ اور سڈّیپ دلّی دونوں نے ان سے کہا کہ وہ والمیکی کی رامائن کو اپنی مادری زبان تامل میں پیش کریں۔ کمبن پکے وشنو تھے بھی۔ یہ بات ان کی شاعری میں صاف جھلکتی ہے۔ انھوں نے راجہ کا کہنا مان لیا اور تامل میں رامائن کی کہانی لکھ ڈالی۔ کمبن کی لکھی ہوئی رامائن کے شعر تقریباً بارہ ہزار ہیں۔

اُنھوں نے رامائن کے علاوہ اور بھی کئی اچھی اچھّی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن رامائن کی تصنیف سے ہی ان کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی۔ عالموں و مہاراجوں نے ان کو شاعرِ اعظم کا خطاب دیا۔

کمبن آخر تک اپنے محسن سڈّیپ دلّی کو نہیں بھولے۔ آخری وقت میں بھی اُنھوں نے سڈّیپ دلّی کی تعریف کرتے ہوئے ہی دم توڑا۔

گوسوامی تلسی داس جی اور کوی سمراٹ کمبن دونوں نے رامائن کے ذریعے ہی انسان، بھائی بھائی، راجہ پرجا اور ماں باپ کے فرائض کو بیان کیا ہے۔

کمبن کی لکھی ہوئی رامائن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعر نے نشادوں کے راجہ کا کردار بڑا اعلیٰ اور اچھّا پیش کیا ہے۔ گنگا کے ساحل پر رہنے والے نشادوں کا سردار

گوہ ہے۔ وہ بڑا بہادر ہے۔ وہ شودر ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو چھوٹا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لکشمن کو ہم عام طور پر ہم ایک غصیلے چھتری راجکمار کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں۔ جو اپنے بڑے بھائی رام کے لئے جان بھی دینے کو تیار رہتا ہے۔ لیکن کمبن کی اس رامائن میں لکشمن گوہ کے بارے میں رام سے کہتے ہیں۔

ماں سے بھی زیادہ پیار رکھنے والا گوہ نام کا ایک آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔

گوہ بھی رام کو ویسے ہی پیار کرتا ہے جیسے ماں بیٹے کو۔ وہ سوچتا ہے —— جو رام کبھی دن میں بھی پیدل نہیں چلے، چوبیسوں گھنٹے جن کا حکم بجالانے کے لئے نوکر چاکر تیار رہتے تھے وہ رات میں اکیلے کیسے رہیں گے؟ اگر رات کو پیاس لگی تو وہ کیا کریں گے؟ ان کو پانی لاکر کون دے گا؟ اسی طرح کی فکریں گوہ کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے اس پریم کا اثر رام کی ماں کوشلیا پر اتنا پڑتا ہے کہ بن باس سے لوٹنے پر جب رام ایودھیا واپس آتے ہیں۔ تب وہ چاروں پتروں سے کہتی ہیں —— رام لکشمن کا بن جانا اچھا ہی ہوا نہیں تو گوہ جیسا نیک دوست کیسے ملتا۔ اب گوہ کے ساتھ مل کر تم سب بھائی مل کر اس راجیہ کا کام چلاؤ۔

رام اور نشاد میں بے پناہ محبت تھی۔ کمبن نے اپنی رامائن میں اونچی اور نیچی ذاتوں کی چھوٹی تفریق کو ختم کر دیا ہے اور آدمی اور آدمی کے بیچ پریم کی ایک اچھی مثال دی ہے۔

آسمان میں جیسے چاند چمکتا ہے ویسے ہی تامل ادب میں کمبن چمکتے ہیں۔ ان کی رامائن 'کمب رامائن' کہلاتی ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک آسان زبان میں نیچے دی جاتی ہے۔

کمبن بال کانڈ میں ایودھیا پوری کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایودھیا پوری کی جنت سے بھی بہتر مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایودھیا کے سوا دوسری کوئی جنت نہیں۔ ان جذبات سے پُر ان کے ایک شعر (پد) کا مطلب نیچے دیا گیا ہے۔

ویدوں میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں اچھے کام کرنے والے لوگ جنت میں جاتے ہیں۔ ایودھیا

میں تو رام چندر جی جیسے نیک اور اچھے راجہ اچھا کام کرنے والوں میں سب سے بہتر مانے جاتے ہیں۔ ان کی رعایا بھی "جیسا راجہ ویسی پرجا" کی کہاوت کے مطابق شری رام چندر جی ہی کی طرح تھی۔ راجہ رام جیسے نیک اور اچھے انسان ایودھیا پر راج کر رہے تھے۔ اس لئے ایودھیا سے بڑھ کر دوسرا سورگ کہاں ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ سورگ کے ادھی پتی "شری من نارائن۔ جب رام کا اوتار لے کر ایودھیا میں آگئے تب سورگ میں کون رہے گا؟ اس لئے سورگ اصل میں ایودھیا ہی ہے۔

ایک اور مثال لیجئے:

ایودھیا میں کوئی دھنی نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں کوئی غریب نہیں تھا اس لئے امیر غریب کا نام بھی ایودھیا کے بسنے والے نہیں جانتے تھے۔ سب لوگ برابر تھے۔

ایودھیا میں کوئی شخص طاقت ور نہیں تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کا مقابلہ کرنے والا کوئی بہادر نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ــــ سب کی طاقت برابر تھی۔ وہاں لوگ کمزوری کا نام تک نہیں جانتے تھے۔

ایودھیا میں سچائی کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ وہاں جھوٹ بولنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ یعنی ــــ ایودھیا کے باشندے جھوٹ کا نام تک نہیں جانتے تھے۔ وہاں سب کے سب سچ بولنے والے تھے۔

ایودھیا میں گیانی لوگ نہ تھے۔ کیونکہ وہاں کوئی اگیانی نہیں تھا۔ یعنی ــــ سب کے سب گیانی تھے۔

اس طرح "ایودھیا" جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک آدرش سماج کا تصور ہے۔

کمبن ویشنو عقیدے کے ماننے والے سنت نمال وار کے بھگت تھے۔ ان کی رامائن اور والمیکی کی رامائن میں کافی جگہوں پر فرق ہے۔ کمبن نے اپنی رامائن میں تامل (دراوڑ) تہذیب کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کمبن نے رامائن کے علاوہ گیارہ کتابیں اور لکھی تھیں۔ جن میں سے شٹھ گوپر اندادی، سرسوتی اندادی، ایر اوپت، شیلے اوپت وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اُنھیں لافانی بنانے والی کتاب ان کی رامائن ہی ہے۔

تامل ادب میں کمبن کو وہی مقام حاصل ہے جو سنسکرت ادب میں والمیکی کا ہے۔ تامل زبان کو ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو دیش کے اس مہاکوی پر فخر رہے گا۔

پرتھوی راج

آج سے لگ بھگ ۸۰۰ سال پہلے دِلّی پر ایک نہایت طاقت ور راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا نام تھا پرتھوی راج چوہان۔ پرتھوی راج اپنے زمانے کا بڑا لائق بہادر طاقت ور راجہ تھا، اس کی طاقت کا لوہا دُور دُور کے راجے مانتے تھے۔

پرتھوی راج کی پیدائش شاکمبھری کے چوہان خاندان میں ہُوئی تھی۔ شاکمبھری کے چوہان ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لئے مشہُور تھے۔ پرتھوی راج کے پتا ارنوراج کا بیاہ گجرات کے چالوکیہ راجہ جے سنگھ کی بیٹی کے ساتھ ہوا تھا جس کا نام کنچن دیوی تھا۔ کنچن دیوی کے علاوہ ارنوراج کی ایک رانی اور تھی۔ جس کا نام تھا سُدھوا۔ ارنوراج کی اس رانی سے تین لڑکے ہُوئے اور کنچن دیوی سے ایک لڑکا ہُوا۔ کنچن دیوی کے لڑکے کا نام سومیشور تھا۔ پرتھوی راج سومیشور کے بیٹے تھے۔

ارنوراج کی موت کے بعد ان کا ایک لڑکا وشال دیو، جس کا نام وگرہ راج بھی تھا، راجہ ہُوا۔ وگرہ راج بڑا ہی عظیم الشان راجہ ہُوا۔ اس نے لگ بھگ دس برس تک حکومت کی۔ وگرہ راج نے بہُت سے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو ہرا کر ایک بہُت بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس نے دِلّی کے تومر راجہ کو ہرا کر دلّی کو بھی اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ پنجاب میں حصار ضلع کے ہانسی نامی مقام سے لے کر شمال میں سہارن پور (اُتر پردیش) اور جے پور (راجستھان) تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ وگرہ راج کی موت کے بعد دو راجہ اور ہوئے۔ ان کے بعد سومیشور گدی پر بیٹھا۔

سومیشور نے ہے ہیا خاندان کی ایک راجکماری کرپور دیوی سے بیاہ کیا۔ اس

راجکماری سے اس کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام پرتھوی راج رکھا گیا اور چھوٹے کا ہری راج۔

پرتھوی راج بڑا ہونہار تھا۔ اسے بچپن ہی سے گھوڑے کی سواری اور جنگی تربیت کے ساتھ ساتھ امور سلطنت بھی سکھائے جانے لگے۔

پرتھوی راج کے پتا راج سومیشور بڑے ہی لائق اور بہادر راجہ تھے۔ ان کے راج میں رعایا بڑی سکھی اور خوش حال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا پرتھوی راج بھی اُن کی طرح قابل راجہ بنے۔ اس لئے چھوٹی ہی عمر میں پرتھوی راج کو یو راج (ولی عہد) بنا دیا گیا۔ اور اُنھیں حکومت کے کاموں میں لگا دیا گیا۔ پرتھوی راج ابھی چھوٹے ہی تھے کہ بدقسمتی سے راجہ سومیشور کی اچانک موت ہوگئی۔ ۱۱۷۷ء میں پرتھوی راج اپنے پتا کی گدّی پر بیٹھے۔

پرتھوی راج کی عمر ابھی کچّی تھی اور حکومت کی بھاری ذمہ داری وہ نہیں سنبھال سکتے تھے۔ اس لئے ان کی ماتا کرپور دیوی نے اپنے لڑکے کی طرف سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ کرپور دیوی بڑی لائق اور باصلاحیت خاتون تھیں اور انھوں نے ایک برس تک بڑی مہارت سے حکومت کا انتظام کیا۔ پرتھوی راج کا منتری کدمب واس تھا۔ یہ بڑا ہی وفادار اور قابل آدمی تھا۔ کرپور دیوی نے فوج کا سپہ سالار بھوونائیک ملّ نام کے ایک بہادر شخص کو بنایا۔ بھونائیک ملّ نے فوج کی بڑی اچھی تنظیم کی۔ اور کچھ ہی دن کے اندر پڑوسی راجاؤں کو ہرا کر پرتھوی راج کے دُشمنوں کو ختم کر ڈالا۔ اسی دوران میں کرپور دیوی نے اپنی سلطنت کی راجدھانی اجمیرو (حال اجمیر) کو بڑی ترقی دی۔

ایک برس تک اپنی ماں کی نگرانی میں راج چلانے کے بعد پرتھوی راج نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حکومت سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد پرتھوی راج کے چاروں طرف مُصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔ ۱۱۷۸ء میں خبر ملی کہ ملتان اور کچھ کی

طرف سے ریگستان کو پار کرتا ہؤا غور کا مسلمان حکمران شہاب الدین غوری گجرات کی طرف بڑھ رہا ہے۔

شہاب الدین غوری نے اپنی عظیم الشان فوج کے بل بوتے پر مارواڑ کے چوہانوں کی سلطنت پر حملہ کرکے اُن کی راجدھانی ناڈول پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ گجرات کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ پرتھوی راج کے پاس جب یہ خبر پہونچی کہ شہاب الدین نے ناڈول پر قبضہ کرکے سومیشور کے مندر کو تباہ کر دیا تو اُسے بے حد غصّہ آیا۔ اور شہاب الدین سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن پرتھوی راج کا منتری بڑا ہی چالاک تھا۔ اس نے پرتھوی راج کو مشورہ دیا کہ پہلے شہاب الدین کو گجرات کی فوجوں سے لڑکر تھک لینے دیجئے۔ جب اس کی فوج تھک جائے تب اس پر حملہ کرنے سے یقیناً کامیابی ہوگی۔

پرتھوی راج نے اپنے وزیر کی صلاح لی۔ اور شہاب الدین سے لڑنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد خبر ملی کہ گجرات کے راجہ نے شہاب الدین غوری کو بُری طرح ہرا دیا ہے۔ اس خبر سے پرتھوی راج کو بڑی مُسرت ہوئی۔

لگ بھگ اسی وقت پرتھوی راج کے چچیرے بھائی ناگ ارجن نے بغاوت کر دی۔ ناگ ارجن نے دیکھا کہ پرتھوی راج ابھی بہت چھوٹا ہے اور اُسے گدی سے ہٹا کر خود راجہ بننا بڑا آسان ہے۔ پرتھوی راج عمر میں چھوٹا ہونے پر بھی بڑا ہی باہمت اور لائق تھا اس نے خود ہی ایک فوج لے کر ناگ ارجن پر حملہ کیا اور اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ناگ ارجن تو کسی طرف اپنی طرف بچا کر بھاگ نکلا لیکن اس کی فوج کو پرتھوی راج نے گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔

پرتھوی راج نے کچھ دنوں کے بعد اپنی سلطنت بڑھانے کی طرف دھیان دیا۔ اس نے ریواڑی، بھوانی اور اس کے آس پاس کے علاقے پر حملہ کیا۔ اس علاقے پر بھاڈانک خاندان کے سردار کی حکومت تھی۔ بھاڈانک سردار نے ہاتھیوں کی ایک بڑی

فوج لے کر پرتھوی راج کا مقابلہ کیا لیکن پرتھوی راج کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ اس کا پورا علاقہ جیت کر پرتھوی راج نے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔

پرتھوی راج نے کئی دوسرے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو بھی ہرایا اور ان کے علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ لیکن اس کی سب سے مشہور لڑائی جے جاک بُھکت کے چندیل راجہ پرمال کے ساتھ ۱۱۸۲ء میں ہوئی۔ جے جاک بُھکت کا علاقہ اب بندھیل کھنڈ کہلاتا ہے۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ راجہ پرمال کی فوج میں آلہا اور اُودل نام کے دو بھائی تھے جو بڑے بہادر تھے۔ آلہا اودل نے بڑی بہادری کے ساتھ پرتھوی راج کی فوج کا مقابلہ کیا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دونوں ہی طرف کے کئی بڑے بڑے سردار میدان میں کھیت رہے۔ آلہا اور اودل بھی مارے گئے بعد پرتھوی راج کو آخر میں فتح ہوئی۔ اس لڑائی میں آلہا اودل نے ایسی بے مثال بہادری دکھائی کہ ان کی بہادری کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ آج بھی گاؤں اور شہروں میں لوگ جگہ جگہ آلہا گاتے ہیں۔ آلہا بڑی ہی جوشیلی بھاشا میں لکھی گئی ایک کاویہ (نظم) ہے۔ جس میں آلہا اودل کی بہادری کے سینکڑوں قصّے ہیں۔ اسی کتاب میں آلہا اودل کی پرتھوی راج کے ساتھ لڑائی کا بھی حال درج ہے۔

چندیل پرمال کو ہرانے اور اس کی راجدھانی مہوبا پر قبضہ کے بعد پرتھوی راج نے اپنا رُخ گجرات کی طرف پھیرا۔ گجرات اس وقت کافی طاقت ور سلطنت تھی جس پر بھیم دوتیہ کی حکومت تھی۔ ۱۱۸۷ء کے لگ بھگ پرتھوی راج نے گجرات پر حملہ کیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر میں گجرات کے راجہ نے پرتھوی راج کی طاقت کا لوہا مان کر اس سے دوستی کر لینے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں راجاؤں میں صلح ہو گئی۔

پرتھوی راج کی سلطنت کی سرحد اُتر پچھم میں حصار اور سرہند اور اُتر میں دِلی

تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی راجدھانی اجمیرہ یا اجمیر تھی۔ پرتھوی راج کی حکومت کی دکھنی سرحد میواڑ اور ناڈول کی ریاستوں سے اور پوربی سرحد گوالیار اور قنوج کی سلطنتوں کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ پرتھوی راج کے وقت میں لاہور پر یامینی راجاؤں کی حکومت تھی۔ اور ان کی سلطنت کی سرحدیں بھی پرتھوی راج کی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ پرتھوی راج کے زمانے کی پتھر کی تین چٹانیں ملی ہیں جن پر عبارتیں کندہ ہیں۔ اور سونے اور چاندی کے کچھ سکے بھی ملے ہیں۔

پرتھوی راج بہادر، فاتح اور جنگ جو راجہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ شاعروں اور کلاکاروں کی بھی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس کے دربار میں جیانک نامی ایک نہایت قابل کشمیری شاعر رہتے تھے۔ جیانک نے پرتھوی راج کی دوسرے راجاؤں کے ساتھ لڑائیوں کا حال اپنی منظوم تصنیف پرتھوی راج وجے میں لکھا ہے۔ آشادھر نام کا ایک جین عالم بھی پرتھوی راج کے دربار میں رہتا تھا۔ اس نے کئی کتابیں لکھیں

پرتھوی راج بہت دنوں تک امن وچین کے ساتھ حکومت نہیں کر پایا تھا کہ ہندوستان پر غیر ملکی حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ شہاب الدین غوری کا حال ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں، جسے ۱۱۷۸ء میں گجرات کے راجہ نے ہرا کر واپس کر دیا تھا۔ یہی غوری ۱۱۸۶ء میں غزنی کے راجہ خسرو ملک کو گدی سے ہٹا کر خود غزنی کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے بھارت پر حملہ کرنے اور اپنی سلطنت قائم کرنے کی تیاری زور شور کے ساتھ شروع کی۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ غزنی کے یامنی سلطان کی سلطنت بھارت میں لاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ غوری نے ایک بڑی فوج کے ساتھ غزنی سے سے کوچ کیا اور سب سے پہلے سرہند (جسے اس وقت تبرہند کہتے تھے) پر حملہ کیا۔ سرہند پرتھوی راج کی سلطنت میں تھا۔ غوری نے تبرہند کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اپنے ایک سردار ملک ضیاء الدین کو ۱۲۰۰ سواروں کے ساتھ اس کی حفاظت کی

ذمّہ داری سونپ کر پھر غزنی لوٹ گیا۔ اس بار اس کا ارادہ اور زیادہ تیاری کر کے لوٹنے کا تھا۔

سرہند کے علاقے پر غیر ملکی مسلمانوں کا قبضہ ہونے سے پرتھوی راج کے سرداروں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ پرتھوی راج تو اجمیر میں رہتا تھا۔ لیکن اس کا ایک سردار گووند راج دلی کا راجیہ پال تھا۔ گووند راج نے اپنے لڑکے چندر راج کو پرتھوی راج کے پاس اجمیر بھیج کر مطلع کیا کہ شہاب الدّین نے پرتھوی راج کے علاقے میں گھس کر سرہند کے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں تباہی اور بربادی پھیلائی ہے۔

پرتھوی راج کو جب بھارت کے راجپوت راجاؤں اور چھوٹے سرداروں کی اس مصیبت کا پتہ چلا تو اسے بہت غصّہ آیا اور اس نے شہاب الدین کے خلاف ان کی مدد کرنے کا ارادہ کیا۔ فوراً ہی شہاب الدین کو کچلنے کے لئے اجمیر سے چل پڑا۔

۹۱-۱۱۹۰ء میں دلی سے ۸۰ میل دور ترائن کے میدان میں پرتھوی راج کے ماتحت مختلف راجپوت راجاؤں کی ایک بڑی فوج کا شہاب الدّین کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ پرتھوی راج کی فوج میں دو لاکھ گھوڑ سوار اور تین ہزار ہاتھی تھے۔ شہاب الدین کی فوج بھی بہت بڑی تھی۔

ترائن کی یہ لڑائی تاریخ میں راجپوتوں کی بہادری کی شاندار مثال ہے۔ خوفناک جنگ شروع ہوئی۔ لیکن جلد ہی راجپوتوں نے شہاب الدّین کی فوج کو دائیں اور بائیں سے کاٹ ڈالا۔ مسلمان فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک سردار نے شہاب الدین کو میدان چھوڑ کر بھاگنے کی صلاح دی۔ لیکن شہاب الدّین بھی انتہائی بہادر آدمی تھا۔ اس نے بھاگنے کے بجائے اپنی فوج کی ہمّت بندھاتے ہوئے آگے بڑھنے کے لئے للکارا اور اپنی تلوار نکال کر راجپوتی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ دلی کے راجیہ پال گووند راج نے جب شہاب الدّین کو آتے دیکھا تو اپنا ہاتھی اس کے سامنے لاکر اڑا دیا۔ شہاب الدّین نے

گووندراج کو سامنے دیکھ کر اپنا برچھا پھینک کر وار کیا۔ جس سے گووندراج کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے۔ گھائل ہونے کے بعد بھی گووندراج نے جوابی حملے میں جو برچھی پھینکی اس سے شہاب الدّین بُری طرح گھائل ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا کہ اُس کے ایک سردار نے جان پر کھیل کر اپنا گھوڑا دوڑایا اور شہاب الدّین کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر میدانِ جنگ سے لے بھاگا۔ شہاب الدّین کے میدان سے بھاگتے ہی اُسکی فوج کے پیر بالکل اُکھڑ گئے۔ وہ بھاگ نکلی۔

ترائن کی لڑائی میں پرتھوی راج کے سپہ سالار سکند نے بڑی بہادری دکھائی تھی اور اسی کی ہنرمندی سے بھارتی فوج کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پرتھوی راج آگے بڑھا اور اس نے سرہند کے قلعے کو گھیر لیا۔ قلعے کے سردار ضیاء الدین نے ۱۳ مہینے تک قلعے کی حفاظت کی لیکن آخر میں اُسے ہار مان کر ہتھیار ڈالنا پڑا۔ اور پنجاب دوبارہ پرتھوی راج کے قبضے میں آگیا۔

شہاب الدّین نے لڑائی میں ہار کر بھی ہمّت نہ ہاری۔ اس نے غزنی پہونچ کر پھر ایک بہت بڑی فوج اکٹھی کی اور پرتھوی راج سے بدلہ لینے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے ایک لاکھ دس ہزار سپاہی اکٹھے کئے اور پشاور اور ملتان ہوتا ہوا لاہور پہونچا۔

پرتھوی راج کو شہاب الدّین کے دوبارہ حملہ کرنے کے ارادے کا پتہ چلا تو اُس نے سب راجپوت راجاؤں سے کہلایا کہ وہ مل کر غیر ملکی شہاب الدّین کا مقابلہ کرنے کے لئے پرتھوی راج کے ساتھ آملیں۔ اُس کے کہنے پر بھارت کے مختلف راجا اپنی فوج سمیت آپہنچے۔ پرتھوی راج نے تین لاکھ گھوڑ سوار تین ہزار ہاتھی اور بے شمار پیدل فوج اکٹھی کی۔

پرتھوی راج نے اپنی فوج کے ساتھ پھر ترائن کے میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ اور شہاب الدّین کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر شہاب الدّین نے سرہند پر پھر قبضہ کر لیا اور

ترائن کی طرف بڑھنے لگا۔ پرتھوی راج نے لڑائی میں ہونے والے اس خون خرابے کو روکنے کے لئے شہاب الدین کے پاس ملتان کے نزدیک پیغام بھجوایا کہ اگر وہ سرہند اور پنجاب کو قبضے میں رکھنا چاہتا ہے تو پرتھوی راج کو اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ اس بات سے شہاب الدین کو ایک چال چلنے کا موقعہ مل گیا۔ اُس نے پرتھوی راج کو کہلا بھیجا کہ میں اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کو جواب بھیجوں گا۔ جب تک جواب نہ پہونچے اور کوئی فیصلہ نہ ہو تب تک لڑائی شروع نہ ہو۔ یہ بات آپس میں طے ہو گئی۔

مگر شہاب الدین کے دل میں دھوکا تھا۔ ادھر راجپوتوں نے سوچا کہ لڑائی رُکی ہوئی ہے اس لئے وہ رات کے وقت ناچ رنگ میں لگ گئے۔ ادھر شہاب الدین نے اپنی فوج کے ایک چھوٹے سے حصے کو راجپوت فوج کے سامنے پڑا رہنے کا حکم دیا اور خود راتوں رات ساری فوج کے ساتھ پرتھوی راج کی فوج کے پیچھے پہونچ گیا۔ پوری طرح دن بھی نہیں نکلا تھا کہ اُس نے غافل پڑی راجپوت فوج پر پیچھے سے اچانک حملہ کیا۔

اس حملے سے راجپوت فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ پرتھوی راج بہادر تھا۔ اسے ایسے دھوکے کی اُمید نہ تھی۔ شہاب الدین کے حملے سے اس کی فوج کی حالت بگڑنے لگی لیکن پرتھوی راج نے بڑے اطمینان اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی گھوڑ سوار فوج کے ساتھ شہاب الدین کی فوج کو ہرا کر پیچھے ہٹا دیا۔

اب پرتھوی راج نے اپنی فوج کو پھر سے اکٹھا کیا۔ ادھر شہاب الدین نے اپنے گھوڑ سواروں کو چار حصّوں میں بانٹا اور پرتھوی راج کی فوج پر چاروں طرف سے حملہ کیا۔ دوپہر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، جس میں ایک لاکھ راجپوت سپاہی کام آئے۔ پرتھوی راج خود بھی شاید اسی لڑائی میں مارا گیا۔

ترائن کی یہ دُوسری لڑائی ۱۱۹۲ء میں ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ جنگ

نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اُتّر بھارت میں چوہانوں کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ پرتھوی راج کی اس ہار کا سارے دیش پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ اور ہندوستانی راجاؤں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ شہاب الدّین کے لئے اب ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنا آسان ہوگیا۔

پرتھوی راج اپنے عہد کا ایک انتہائی لائق اور بہادر سپہ سالار اور اچھا حکمران تھا۔ اس نے اُتّر بھارت کے مختلف چھوٹے چھوٹے راجپوت راجاؤں کو منظّم کیا تھا۔ لیکن پرتھوی راج میں ایک نقص یہ تھا کہ وہ راج نیتی کے معاملے میں ہوشیار نہ تھا۔ اگر اس نے بھارت کی پچھمی سرحد کی حفاظت کا اچھا انتظام کردیا ہوتا تو شہاب الدّین کبھی بھارت میں داخل نہ ہوتا اور نہ بھارت میں غزنی کے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوتی۔

پرتھوی راج کے خاتمے کے ساتھ ہی چوہان خاندان کا سُورج غروب ہوگیا۔ دلی میں شہاب الدّین کا ایک صوبے دار مقرّر ہوا۔ جس کا نام قطب الدّین تھا۔ قطب الدّین نے دلی میں ایک نئی سلطنت قائم کی۔ بعد میں اس نے اجمیر پر بھی قبضہ کرلیا اور اس طرح چوہان خاندان کا نام ونشان مٹ گیا۔

مدھواچاریہ

دکن بھارت کے کنّڑ پردیش میں اُڈپی نام کی جگہ کے پاس ایک گاؤں میں ایک برہمن رہتا تھا جس کا نام مدھیہ گیہ تھا۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ جس سے اس کی گذر بسر ہوتی تھی۔ مدھیہ گیہ بڑا قابل تھا۔ اس کی قابلیت کی وجہ سے ہی لوگ اُسے "بھٹ" کہتے تھے۔

مدھیہ گیہ کی پتنی ویدوتی بڑی سلیقہ مند اور سُندر تھی۔ ویدوتی کے بطن سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بدقسمتی سے دونوں لڑکے چھوٹی ہی عمر میں مر گئے۔ مدھیہ گیہ کو اس بات کی بڑی فکر ہوئی کہ اگر اس کے کوئی لڑکا نہ ہوا تو اس کا خاندان کیسے چلے گا۔ بارہ برس تک بڑی لگن سے مدھیہ گیہ اور ویدوتی نے اُڈپی کے مندر میں بھگوان کی پُوجا کی اور وردان مانگتے رہے کہ ان کے ایک لڑکا ہو۔ بالآخر، ۱۱۹۹ء میں دُسہرے کے دن ویدوتی نے ایک پُتر کو جنم دیا۔ پتا نے اس لڑکے کا نام واسودیو رکھا۔ آگے چل کر یہی واسودیو مادھو آچاریہ کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئے۔

واسودیو کے بچپن کے بہت سے قصّے مشہور ہیں۔ ایک واقعہ یوں بتایا جاتا ہے کہ واسودیو جب پانچ برس کے تھے، تو ایک دن گھر سے کہیں لاپتہ ہو گئے۔ ان کے ماں باپ نے انھیں بہت ڈھونڈا۔ لیکن ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ تین دن کے بعد اچانک مدھیہ گیہ کو خبر ملی کہ واسودیو تو اُڈپی کے مندر میں ہے۔ بھاگتے ہوئے دونوں اُڈپی پہنچے۔ وہاں بھگوان اننتیشور کے مندر میں مورتی کے سامنے بھگتوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ننھا واسودیو لوگوں کو بتا رہا تھا کہ شاستروں کے مطابق بھگوان وشنو کی پوجا کرنے کا صحیح

طریقہ کیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد تو اس بات میں شک ہی نہیں رہ گیا کہ واسودیو کوئی معمولی بچے نہیں بلکہ کوئی اوتار تھے۔

(۳) واقعہ کے کچھ دنوں بعد وہ گاؤں کی پاٹھ شالا میں پڑھنے کے لئے بھیجے گئے۔ واسودیو کھیل کود، کشتی لڑنے، دوڑنے، کودنے پھاندنے اور تیرنے میں سب سے آگے رہتے۔ ان کے ننھے سے جسم میں اتنی طاقت تھی کہ لوگ حیرت کرتے اور انہیں پیار سے 'بھیم' کہہ کر پکارتے تھے۔ واسودیو کی غیر معمولی طاقت کی وجہ ہی سے شاید انھیں پون سُت کا اوتار کہا جانے لگا اور بعد میں لوگ اس بات میں یقین بھی کرنے لگے۔

لیکن واسودیو کھیل کود میں جہاں اپنے سے بڑے لڑکوں سے آگے تھے وہاں پڑھائی لکھائی میں بڑے ڈھیلے تھے۔ آخر میں اُستاد نے واسودیو کو سمجھا بجھا کر راستے پر لانے کی ساری کوشش چھوڑ دی۔ واسودیو بھی پاٹھ شالا چھوڑ کر گھر چلے آئے۔

اب واسودیو نے اپنے آپ ہی پڑھنا شروع کیا اور جلد ہی ویدوں اور شاستروں کا پورا گیان حاصل کر لیا۔ ترک شاستر (منطق) اور گرامر (قواعد) کے تو وہ مہاپنڈت تھے

پاٹھ شالا چھوڑنے کے بعد سے واسودیو کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہونے لگا۔ انھیں گھر بسانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ویدوں، ویدانگوں اور شاستروں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی ساری زندگی دھرم کے پرچار میں لگائیں۔ پندرہ برس کی عمر میں اُنھوں نے یہ آخری فیصلہ کر لیا کہ اُنھیں سنیاس لے لینا چاہئے۔

سنیاس لینے کے لئے گورو کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت ڈھونڈنے پر اَچیوت پریکش نامی ایک سنیاسی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ واسودیو نے اَچیوت پریکش کو اپنا گرو چُنا۔

لیکن سنیاس لینے سے پہلے ایک اور چیز ضروری تھی اور وہ تھی ماں باپ کی اجازت۔ مدھیہ گیہ اور ویدوتی کے یہاں ایک ہی لڑکا تھا۔ اسے سنیاس لینے کی دُھن سوار تھی۔

اس سے بدھیہ گیہ اور ویدوتی بہت دُکھی ہوئے۔ انھوں نے واسودیو کو یہ کہہ کر سنیاس لینے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ اگر تم نے سنیاس لے لیا تو ہمارے مرنے کے بعد ہمارا انتم سنسکار کیسے ہو گا۔ آخری رسوم ادا نہ ہونے کی وجہ ان کی مکتی نہ ہو گی لیکن واسودیو سنیاس لینے کا عہد کر چکے تھے۔ آخر میں اُنھوں نے اپنے ماں باپ کو دلاسہ دیا کہ ان کے یہاں ایک اور لڑکے کا جنم ہو گا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ویدوتی نے ایک اور پُتر کو جنم دیا۔ اس کا نام وشنو تیرتھ رکھا گیا۔ جب تک وشنو تیرتھ کا جنم نہیں ہو گیا تب تک واسودیو نے سنیاس نہیں لیا۔ لیکن چھوٹے بھائی کے جنم کے بعد اب کوئی رُکاوٹ نہیں رہ گئی۔ اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے سنیاس لیا۔ سنیاسی ہونے کے بعد ہی اُنھیں پُورن پراگیا (پورن بودھ) کا خطاب دیا گیا۔ لوگ اُنھیں واسودیو کی بجائے اسی نام سے پُکارنے لگے۔

اب پورن پراگیا اپنے گُرو اچیوت پریکش کے ساتھ مٹھ میں رہنے اور پوجا پاٹھ اور مطالعہ کرنے لگے۔ اچیوت پریکش ویدانت کے بڑے بھاری عالم تھے۔ پورن پراگیا بھی وید، ویدانگ اور شاستروں کی گہری جانکاری رکھتے تھے۔ اب انھیں ویدانت کا مطالعہ اور اس پر غور کرنے کا موقع ملا۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد پورن پراگیہ کا گُرو سے اختلاف رہنے لگا۔ اکثر اچیوت پریکش سے ان کی بحث ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے پُورن پراگیہ کی علمیت اور ذہانت نکھرنے لگی۔ آس پاس ان کی قابلیت اور علمیت کی شہرت پھیلنے لگی۔ ابتدا میں اچیوت پریکش پُورن پراگیہ کے جواب سے مُتفق نہیں ہوتے تھے۔ لیکن وہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ پورن پراگیہ کے سوچنے کا طریقہ بالکل نیا اور انوکھا ہے اور ان کے جوابوں میں بڑی جان ہے۔

اچیوت پریکش نے اُنھیں مٹھ کا نگران اعلیٰ بنایا۔ اس طرح پورن پراگیہ اننتیشور کے مندر کے مٹھ کی سب سے اُونچی گدی پر بیٹھے۔ مٹھ کے نگران اعلیٰ بننے کے ساتھ ہی

اُن کا نام پوُرن پراگیہ سے بدل کر آنند تیرتھ یا مدھواچاریہ رکھ دیا گیا۔ بعد میں ان کا نام مدھواچاریہ ہی سب سے زیادہ مشہور ہوُا۔

شنکراچاریہ کا کہنا تھا کہ سنسار میں ایک ایشور کو چھوڑ کر اور جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں وہ سب جھوٹ ہے، مایا کا کھیل ہے۔ ایشور کو صرف گیان کے ذریعے ہی سمجھا اور پایا جا سکتا ہے۔

مدھواچاریہ کو شنکراچاریہ کی یہ بات درست نہیں معلوم ہوئی۔ اُنھیں یہ دیکھ کر دُکھ ہوُا کہ شنکراچاریہ کے شاگرد جنتا کو صحیح راستے پر نہیں لے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ دیش بھر میں گھوم گھوم کر لوگوں کو میں دھرم اور ایشور کے بارے میں اپنا مت بتاؤں گا۔

اسی ارادے سے مدھواچاریہ سارے ملک کے سفر کے لئے چل پڑے۔ سب سے پہلے وہ دکھن ہندوستان گئے۔ ان کے ساتھ اچیوت پریکش اور کچھ شاگرد بھی تھے۔

اس زمانے میں دکھن بھارت کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹا تھا۔ اکثر آپس میں ان کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن ان راجاؤں کے راجہ عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ بھری سبھا میں جو عالم دُوسرے مت یا عقیدے کے عالم کو شاستر کے معنی و مطلب بتانے میں ہرا دیتا تھا، اس کے مت یا عقیدے کو راجہ پرجا مان لیتے تھے۔

سب سے پہلے مدھواچاریہ منگلور پہونچے۔ یہاں اُنھوں نے اپنے مخالفوں کو مذہبی بحث میں بڑی آسانی سے ہرا دیا۔ منگلور سے آگے بڑھ کر وہ ترِوِنکور پہونچے۔ ترِوِنکور کے راجہ نے ان کی بڑی عزت کی۔ اور اُنھیں دربار میں آکر شاستر کے معنی و مطالب بتانے کے لئے مدعو کیا۔ مدھواچاریہ تو اسی کام کے لئے نکلے ہی تھے، انھوں نے راجا کی بات منظور کر لی۔ اسی سمے شرنگیری مٹھ کے نگران اعلیٰ ودیا شنکر بھی ترِوِنکور آ پہونچے۔ شرنگیری کا مٹھ ان چار مٹھوں میں سے ایک تھا۔ جسے شنکراچاریہ نے خود قائم کیا تھا۔ ترِوِنکور

کے راجا کے سامنے دربار میں مدھواچاریہ کی جیت ہوئی۔ اس کے بعد مدھواچاریہ اپنے چیلوں کے ساتھ رامیشورم پہونچے۔ یہاں بھی اپنے مخالفوں کو ہرانے کے بعد وہ شری رنگم گئے اور شری رنگم سے اُڈپی لوٹ آئے۔

مدھواچاریہ کے اس دَورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکھن بھارت میں ان کی جیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ لیکن شنکراچاریہ کے چیلوں کو اپنی ہار بہُت کھلی۔ وہ مدھواچاریہ کے دشمن بن گئے۔ انھوں نے جہاں تہاں مدھواچاریہ اور ان کے چیلوں کو ستانا شروع کیا۔ لیکن اس سے مدھواچاریہ جھُکے نہیں۔

اُڈپی لوٹ کر مدھواچاریہ نے بھگوت گیتا کی شرح لکھی اور ویدانت سوتروں کی وضاحت کا کام ہاتھ میں لیا۔ اس طرح کئی برس تک اُڈپی میں ٹھہرنے رہنے کے بعد مدھواچاریہ نے اتر بھارت کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُتر بھارت میں اس زمانے میں مسلمانوں کا کافی زور تھا۔ کئی بار مدھواچاریہ کو مسلمان سرداروں کی جاگیروں اور علاقوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن مدھواچاریہ فارسی بول بھی سکتے تھے۔ وہ مسلمان سرداروں سے فارسی میں بات کر کے اُنھیں متاثر کر دیتے تھے۔ اُنھیں مسلمانوں کے ہاتھوں کبھی کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ مدھواچاریہ کا کہنا تھا کہ کسی انسان کے دل میں جگہ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے اسی کی بھاشا میں بات چیت کی جائے۔

اتر بھارت میں مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے آخیر میں مدھواچاریہ ہردوار پہونچے۔ یہاں انھوں نے کئی دنوں تک اپاسنا اور دھیان کیا۔ اسی بیچ وہ کچھ دنوں کے لئے ہمالیہ کی گپھا میں چلے گئے۔ کئی دنوں تک اکیلے رہنے کے بعد وہ ہردوار لوٹ آئے۔ اور انھوں نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ بھگوان وشنو کی پوجا ہی ایشور کی سچی پوجا ہے۔ یہیں انھوں نے ویدانت سوتر کی اپنی شرح بھی شائع کی۔ آج بھی ان کی شرح

اپنے ڈھنگ کی انوکھی کتاب مانی جاتی ہے۔

ہردوار سے انھوں نے اپنا دورہ پھر شروع کیا۔ اب جہاں کہیں بھی وہ گئے انھوں نے بھگوان وشنو کی ہی پوجا کرنے کا اُپدیش دیا۔ اُتر بھارت سے لوٹتے وقت وہ کلیان (حیدر آباد) میں کچھ دن ٹھہرے۔ کلیان ان دنوں چالوکیہ سامراجیہ کی راجدھانی تھی اور وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔

کلیان میں مدھواچاریہ کا شوبھن بھٹ نامی ایک نہایت مشہور عالم سے شاستر کے معنی و مطالب کے بارے میں مباحثہ ہوا۔ شوبھن بھٹ اس میں ہار گئے۔ اس کا بڑا زبردست اثر پڑا۔ شوبھن بھٹ کے ساتھ ہی ہزاروں افراد نے ویشنو مت کو قبول کر لیا۔ کلیان سے روانہ ہونے سے پہلے مدھواچاریہ نے شوبھن بھٹ کو وہاں کے اپنے مٹھ کا پردھان مقرر کیا۔

اُڈپی لوٹ کر مدھواچاریہ نے اپنے گرو اچوت پریکش کو بھی ویشنو دھرم کی تعلیم دی اور اپنا شاگرد بنا لیا۔ اس زمانہ میں شو یا دیوی کے مندروں میں جانوروں کی قربانی ہوتی تھی۔ مدھواچاریہ نے جانوروں کی قربانی کی بہت مخالفت کی۔

اُڈپی کے نزدیک ہی شرنگیری کا مٹھ تھا۔ مدھواچاریہ کا بڑھتا ہوا اثر شرنگیری مٹھ کے مہنت کو بُرا لگا۔ دکن کے کئی راجہ شنکراچاریہ کے معتقد تھے۔ اس طرح اس مہنت کو راجاؤں کی مدد بھی حاصل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدھواچاریہ اور ان کے مت کو ماننے والوں کے خلاف طرح طرح کے مظالم کئے جانے لگے۔

مٹھ کا بڑا مہنت پدم تیرتھ جانتا تھا کہ اگر مدھواچاریہ کو اپنے خیالات پھیلانے کا موقع ملا تو کچھ ہی دنوں میں ساری جنتا ویشنو ہو جائے گی اور پھر اسے کوئی پوچھے گا نہیں اسی لئے اس نے مدھواچاریہ سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا۔ اس لئے اپنے پیروؤں کو مٹھ میں اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں سب جگہ گھومیں اور

ویشنو سنتوں کو ہر طرح سے ستائیں۔

ادھر تو پدم تیرتھ نے ویشنو دھرم کے پرچارکوں کو روکنے کا یہ انتظام کیا اور ادھر اس نے مدھواچاریہ کے کتب خانے کو تباہ کرنے کی اسکیم بنائی۔ اس نے سوچا کہ اگر مدھواچاریہ کے کُتب خانے کو تباہ کر دیا جائے تو اس سے ویشنو مت کے پرچار میں بہت بڑی رُکاوٹ پڑے گی۔

پدم تیرتھ کے کچھ آدمی چُپ چاپ مدھواچاریہ کی کُٹیا میں پہونچے اور وہاں سے بہت سی کتابیں اُٹھا کر بھاگ گئے۔ یہ کتابیں انھوں نے یہ سوچ کر ایک جگہ زمین میں دفن کر دیں کہ انھیں کوئی کھوج نہ سکے۔ خوش قسمتی سے کمبلا کے راجہ جے سنگھ چالوکیہ کو مدھواچاریہ سے بڑی عقیدت تھی۔ جب مدھواچاریہ نے راجہ جے سنگھ سے مدد مانگی، اُن کے عمّال نے چوروں کا پتہ لگایا۔ اس طرح مدھواچاریہ کی کتابیں واپس مل گئیں۔

مدھواچاریہ نے جن عالموں کو شاستراتھ میں ہرا کر اپنے فرقے میں شامل کیا تھا ان میں پنڈت تری وکرم کا نام سب سے اہم ہے۔ پنڈت تری وکرم شنکراچاریہ کے معتقد تھے۔ لیکن اُنھیں شنکر کے عقیدے سے کچھ بے اطمینانی ہو چلی تھی۔ مدھواچاریہ نے آٹھ دن کے شاستراتھ کے بعد پنڈت تری وکرم کو شکست دی تھی اور اُنھیں اپنے فرقے میں شامل کر لیا تھا۔ تری وکرم کے ویشنو دھرم میں شامل ہونے کی خبر سُن کر دُور دُور کے بہت سے لوگ اپنے آپ ہی ویشنو ہونے لگے۔

جس وقت مدھواچاریہ جے سنگھ کے سلطنت میں گھوم رہے تھے لگ بھگ اُن ہی دنوں ان کے ماتا پتا کی موت ہو گئی۔ اُنھوں نے مدھواچاریہ کا نام اور شہرت پھیلتے دیکھ لیا تھا۔ اُنھیں اپنے بیٹے پر فخر تھا۔

اپنی زندگی کا آخری برس مدھواچاریہ نے کمار دھارا اور نیتر وتی نامی ندیوں کے دوآب میں بڑے اطمینان سے کتاب لکھنے میں گذارا۔ یہیں بیٹھے بیٹھے وہ اپنے چیلوں کو

دھرم کا پرچار کرنے اور مخالفوں کو شاستر ارتھ میں شکست دینے کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔

مدھواچاریہ نے کئی مٹھ قائم کئے۔ موت سے پہلے مدھواچاریہ نے اپنے لائق شاگرد پدما نام تیرتھ کو دھرم پرچار کا بھار سونپ دیا اور اُڈپی کے کرشن مندر کی دیکھ بھال کے لئے اپنے آٹھ خاص چیلوں کی ایک مجلس بنادی۔ ۱۲۸۶ء میں اُنہوں نے بڑے اطمینان اور سکون سے دھیان کرتے ہوئے سفر آخرت کیا۔

مدھواچاریہ بھی رامانج کی طرح بہت بڑے اچاریہ ہوئے ہیں۔ جیو آتما یعنی (جاندار مخلوق) اور پرماتما کا تعلق، مدھواچاریہ کے مطابق آقا اور خادم کا تعلق ہے۔ وشنو کی عبادت سے جیو آتما میں بہت سی ایسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو ایشور میں ہیں۔ لیکن وہ کبھی ایشور کے جیسا نہیں ہو سکتا۔ مدھواچاریہ کا بھی ایک فرقہ بن گیا۔

اُن کے پیرو گوپی چندن کا تلک لگاتے ہیں لیکن بیچ کی لکیر کالی ہوتی ہے جس کے بیچ میں لال نقطہ بنا ہوتا ہے جسم کے مختلف حصّوں میں وہ لوگ چکر کا نشان بناتے ہیں۔ کنڑ میں اس مت کے ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مدھواچاریہ نے ۳۷ کتابیں لکھیں جن میں دو ممتاز ہیں۔ برہم سوتروں کی تشریح اور اُپنشدوں کی تفسیر۔

گیانیشور

گیانیشور تیرھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباو اجداد پیٹھن سے چار کوس دور گوداوری ندی کے شمالی کنارے پر واقع "آپے گاؤں" کے باشندے تھے لیکن کسی خاص سبب سے وہ لوگ "آلندی" گاؤں میں آکر بس گئے۔ یہ لوگ ذات کے برہمن اور پیشے سے گاؤں کے پٹواری تھے۔

گیانیشور کے پردادا "تریمبک پنت" گرو گورکھ ناتھ کے شاگرد اور انتہائی معتقد تھے۔ تریمبک پنت کے لڑکے گووند پنت اور بہو میرا بائی شری گینی ناتھ جی کے سیوک تھے۔ میرا بائی کے ایک لڑکا ہوا، جس کا نام وِٹھل پنت رکھا گیا۔ یہی وٹھل پنت سنت گیانیشور کے والد تھے۔

وٹھل پنت بچپن ہی سے عبادت اور علم کے دلدادہ تھے۔ جنیو کے بعد ہی وہ یاترا کے لئے نکل پڑے۔ راستے میں مشہور عالموں کے پاس رہ کر شاستروں کا مطالعہ کرتے جاتے تھے۔ شادی کے کئی سال بعد تک بھی جب ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے سنیاس لینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ان کی پتنی ان کے اس خیال کی مخالف تھیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اِستری سے نہانے کا بہانہ کر کے گھر سے نکل پڑے۔ اور سیدھے کاشی جا پہنچے وہاں وہ سوامی رامانند کے آشرم میں گئے اور ان سے یہ کہکر کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے سنیاس کی تعلیم لی۔ ان کی پتنی رُکمنی بائی کو جلد ہی اس بات کا پتہ چل گیا۔ لیکن اب وہ رونے دھونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔

کچھ سال بعد سوامی رامانند جی نے اپنے بہت سے شاگردوں کو ساتھ لے کر دھرم

پرچار کی غرض سے جنوب کی طرف سفر کیا۔ اتفاق سے وہ ایک دن آلندی گرام میں پہونچے اور ایک مندر میں ٹھہرے۔ ہمیشہ کی طرح جب رکمنی بائی مندر میں آئیں تو وہاں سوامی رامانند کو دیکھ کر انھیں پرنام کیا۔ سوامی جی نے "پترَوتی" (صاحب اولاد) ہو کہہ کر رکمنی بائی کو آشیرواد دیا۔ اس پر رکمنی بائی نے کہا — میرے سوامی تو آپ ہی کے مُرید بن گئے ہیں۔ اس لئے آپ کا آشیرواد اب کس طرح کامیاب ہوسکتا ہے؟

سوامی رامانند نے بنارس لوٹ کر وِٹھل پنت کو پھر سے گرہست بننے کی اجازت دی۔ وِٹھل پنت گھر لوٹ کر رکمنی بائی کے ساتھ رہنے لگے۔ کچھ وقت کے بعد ان کے نِروت ناتھ، گیانیشور اور سوپان دیو نام کے تین لڑکے اور مُکتا بائی نام کی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

سَری گیانیشور کی پیدائش ۱۲۷۵ء میں آپے گاؤں میں ہوئی۔

حالانکہ گرو کی اجازت ہی سے وِٹھل پنت سنیاس چھوڑ کر گرہست بن گئے تھے۔ پھر بھی شاستر کے مطابق سنیاسی کبھی گرہست نہیں بن سکتا۔ نتیجہ میں سارے سماج نے اُن کا بائیکاٹ کر دیا اور انھیں پاپی اور عیاش کہا جانے لگا۔ نِروت ناتھ جب سات برس کے ہوئے تب وِٹھل پنت کو ان کا جنیو کرنے کی فکر ہوئی۔ لیکن برہمن سماج میں کوئی بھی ان کی موافقت میں ایک لفظ کہنے کو تیار نہ ہوا۔

آخر کار انھوں نے سخت سے سخت کفارہ ادا کرنے کا ارادہ کر لیا اور پنڈتوں سے اپنے لئے فیصلہ طلب کیا۔ شاستروں کی بہت کچھ چھان بین کرنے کے بعد دھرم گروؤں نے یہ آخری فیصلہ صادر کیا کہ شاستروں میں نہ تو وِٹھل پنت کے لئے کوئی کفارہ ہی ہے اور نہ ان کی اولاد کے جنیو کی اجازت دی جاتی ہے۔ ان کے لئے جسم سے سبکدوش ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سُن کر بے چارے وِٹھل پنت کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر بھی انھوں نے اپنا

ارادہ نہیں بدلا اور وہ تمام دنیوی لگاؤ سے منہ موڑ کر تیرتھ راج پریاگ پہنچے۔ وہاں انھوں نے تربینی کے سنگم میں ڈوب کر اپنی جان دے دی۔ رکمنی بائی کو جب پتی کے سورگباش ہونے کی اطلاع ملی تو وہ بھی پریاگ گئیں اور وہاں سنگم میں ڈوب مریں۔ اس طرح برہمنوں کے غلط حکم سے دو جانیں گئیں۔

ماں اور باپ کی وفات کے بعد یہ چاروں بچے یتیم اور بالکل بے سہارا ہو گئے۔ اس وقت نروت ناتھ کی عمر لگ بھگ دس سال کی تھی۔ اس خیال کے تحت کہ اپنے قریبی عزیزوں سے انھیں کچھ امداد ضرور ملے گی، چاروں بچے اپنے آبا و اجداد کے وطن "آپے گاؤں" کی طرف چل دئے۔ وہاں پہونچنے پر ان کے رشتہ داروں نے ان سے بڑا رُوکھا برتاؤ کیا۔ موروثی جائداد میں سے مناسب حصہ دینا تو درکنار انھیں پرانے مکان میں رہنے تک نہیں دیا۔ اب بھیک مانگ کر پیٹ پالنے کے علاوہ ان یتیموں کے لئے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

انھی دنوں نروت ناتھ راستہ بھول گئے اور بھٹکتے بھٹکتے اچانک ایک غار میں جا پہونچے۔ اس غار میں گرو گینی ناتھ کا آشرم تھا۔ گینی ناتھ کو اپنے شاگرد وٹھل پنت کے لڑکے سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے نروت ناتھ کو ریاضت کی تعلیم دی اور سری کرشن بھگوان کی 'اپاسنا' کرنے کا اپدیش دیا۔ کچھ عرصہ گرو کے پاس رہنے کے بعد نروت ناتھ گھر لوٹے اور انھوں نے گیانیشور کو تعلیم دی۔

اپنے دونوں بھائیوں اور بہن کو لے کر نروت ناتھ اب پھر آلندی آ گئے۔ گیانیشور چاہتے تھے کہ برہمن سماج سے جنیو کرنے کی اجازت حاصل کی جائے اور اس طرح دوبارہ سماج میں شمولیت ہو جائے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی بات مان کر نروت ناتھ نے پیٹھن جا کر وہاں کے پنڈتوں سے "شدھی پتر" مانگنے کا فیصلہ کیا۔

گوداوری ندی میں اشنان کرنے کے بعد یہ لوگ گاؤں کے اندر گئے۔ چار دن تک پیٹھن کے پنڈتوں کی ایک سبھا ہوتی رہی۔ انھوں نے سب شاستروں کو چھان ڈالا۔ لیکن

اُن میں کہیں بھی ایسا حوالہ نہیں ملا جس میں کسی کفارے کے ذریعہ سنیاسی کے لڑکے کی شُدھی کی جا سکے یا انہیں جنیو کرنے کی آگیا دی جائے۔ آخر میں پنڈتوں نے مجبور ہو کر بچوں کو یہی اجازت دی کہ وہ بھگوان کا کیرتن کرتے رہیں اور جنیو کرانے کا خیال چھوڑ دیں۔

سبھا ختم ہونے کے بعد کسی پنڈت نے ان کے ناموں کے معنی پوچھے۔ بچوں نے اس کا جو مطلب بتایا اُسے سُن کر عالم دنگ رہ گئے۔ کچھ پنڈتوں کو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے مُنہ سے ایسی گیان کی باتیں سُن کر ہنسی آ گئی۔ اسی دَوران اس طرف سے ایک بھینسا گذرتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک پنڈت بول اُٹھا — اجی نام میں کیا رکھا ہے، کسی چیز کا چاہے جو نام رکھ دو۔ میں کہتا ہوں کہ اس بھینسے کا نام گیانیشور ہے۔

یہ سُن کر گیانیشور نے کہا — سچ مچ مجھ میں اور اس بھینسے میں کوئی فرق نہیں ہے، جو آتما میرے اندر ہے وہی اس میں بھی ہے۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر اس بھینسے کے تین ڈنڈے لگائے۔ کہتے ہیں کہ بھینسے کے ڈنڈے پڑتے ہی گیانیشور کے جسم پر تین نشان اُبھر آئے۔ پنڈت یہ کرشمہ دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔

کچھ لوگ گیانیشور کو عقیدت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ کچھ لوگ ان کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اور کچھ انہیں پُوری طرح جانچنا چاہتے تھے۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر گیانیشور سے کہا کہ اگر تم ہم سے شُدھی پتر لینا چاہتے ہو تو اس بھینسے کے مُنہ سے "وید" کا پاٹھ کرا دو۔ کہتے ہیں۔ یہ سُن کر گیانیشور نے فوراً بھینسے کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اسی لمحہ بھینسے کے مُنہ سے "وید منتر" نکلنے لگے۔ اس کرشمہ کو دیکھ کر پنڈتوں کی آنکھیں کھُل گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف کہانیاں ہیں جو عظیم شخصیتوں کے ساتھ جُڑ جایا کرتی ہیں۔

اس کے بعد گیانیشور اور ان کے بھائی بہن کچھ دن تک پیٹھن میں ہی رہے۔ وہ بلاناغہ گوداوری میں اشنان کرتے، لوگوں کو مذہبی گرنتھ سُناتے اور رات میں بھجن کیرتن کرتے۔ جلد ہی ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔

اتفاق سے پیٹھن کے ایک معزز پنڈت کے یہاں اس کے پتا کا "شرادھ" تھا۔ شری گیانیشور "شرادھ" کے وقت وہاں موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ جیوں ہی برہمن نے اپنے پتروں کو بلانے کا منتر پڑھا اس کے سب پتر مع جسم آ کر سامنے آسن پر بیٹھ گئے۔ لوگ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ گیانیشور کا چمتکار ہے۔ ان کے دل میں گیانیشور کی غیر معمولی شکتی کا ڈر بیٹھ گیا۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد پنڈتوں نے گیانیشور اور ان کے بھائی کو شدھی پتر دیدیا۔ اور اس طرح انہیں پھر سے برہمن سماج میں ملا لیا۔

پیٹھن میں کچھ دن اور رہنے کے بعد گیانیشور اپنی بہن اور بھائیوں کے ساتھ پیدل سفر کرتے ہوئے نیوا نام کے ایک دیہات میں پہنچے۔ گاؤں میں گھستے ہی انہوں نے ایک عورت کو ایک نعش کے پاس روتے دیکھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ مردہ شخص کا نام سچدانند تھا۔ کہتے ہیں کہ گیانیشور نے "ست چت اور آنند تو امر ہیں" کہکر لاش پر ہاتھ پھیرا۔ مردہ فوراً جی اٹھا۔ اس نے گیانیشور کے قدموں پر ماتھا رکھدیا۔ اور ان کا شاگرد ہو گیا۔ اسی سچدانند نے کچھ عرصہ بعد "گیانیشور وجے" نام کے ایک خوبصورت منظوم مجموعہ کی تخلیق کی۔

یہاں سے چل کر گیانیشور پھر آلندی پہنچے۔ ان کے کرشموں کی خبر ان کے آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہاں کے پنڈتوں نے بڑی محبت سے ان کا سواگت کیا۔ دسودا چاٹی نام کے، ایک برہمن کو یہ دیکھ کر بڑی جلن ہوئی۔ اس نے گیانیشور وغیرہ کی سُبکی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور انہیں برابر سنیاسی بالک کہکر مخاطب کرتا رہا۔

ایک بار دیوالی کے موقعہ پر نروت ناتھ نے مکتا بائی سے ایک خاص قسم کے پکوان بنانے کی فرمائش کی۔ جس کی تیاری کے لئے مٹی کے برتنوں کی ضرورت تھی۔ مکتا بائی نے گاؤں کے کمہار سے مٹی کے برتن تیار کرنے کو کہا۔ دسودا چاٹی کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا اور اس نے ڈرا دھمکا کر کمہار کو برتن بنانے سے باز رکھا۔

برتن نہ ملنے پر بے چاری مکتا بائی گھر آکر رو پڑی۔ جب گیانیشور کو اس کے رونے کی وجہ معلوم ہوئی تب کہتے ہیں، انھوں نے "یوگ سادھنا" سے اپنی پیٹھ (کمر) پر وہ پکوان سکوائے۔ وسوواچانتی گیانیشور کے قدموں میں گر پڑا اور اس دن سے ان کا سچا بھگت بن گیا۔

گیانیشور ۱۵ سال کی عمر میں کامل "یوگی" اور بھگوان سری کرشن کے سچے بھگت ہو چکے تھے۔ اپنے بھائی نروت ناتھ سے انھیں بے حد عقیدت تھی۔ نروت ناتھ کو یہ اپنا گرو بھی مانتے تھے۔ انھیں کے کہنے سے گیانیشور نے اس چھوٹی سی عمر میں "سری مد بھگوت گیتا" کی شرح لکھنا شروع کی۔ یہ کتاب ایک سال میں تیار ہوئی۔ اس کا نام گیانیشوری ہے۔ یہ مراٹھی زبان کا لاثانی گرنتھ مانا جاتا ہے۔ اس کی زبان اتنی رنگین اور معلوماتی ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے گیتا کے عمیق علم کا مزا لے سکتے ہیں۔ گیانیشور نے گیانیشوری کے علاوہ اور بھی کئی گرنتھ اور بہت سی کویتائیں لکھی ہیں۔ جن میں سے "امرت انبھو" "چانگ دیو پرشست" "ہری پاٹھ" "یوگ واشسٹھ" "ٹیکا" "سواتم پتر" قابل ذکر ہیں۔ گیانیشوری مکمل کرنے کے بعد گیانیشور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیرتھ یاترا کرنے کے لئے آلندی سے روانہ ہوئے۔ نروت ناتھ اور کئی دوسرے سنت ان کے ساتھ تھے۔

گھومتے گھماتے یہ لوگ کھاڑ پہنچے۔ وہاں کے راجہ کا نام رام رائے تھا۔ اس کی رانی سیتا بائی سنتوں کی بڑی بھگت تھی۔ لیکن راجہ رام رائے سنتوں کا بڑا مخالف تھا۔ راجہ کا حکم تھا کہ کوئی بھی سادھو سنت راجدھانی میں نہ آنے پائے۔ سنت گیانیشور کے اثر سے راجہ رام رائے کا من بھی بدل گیا اور وہ سنتوں کی مخالفت چھوڑ کر ان کی بھگتی کرنے لگا۔

یاترا کرتے ہوئے سنت گیانیشور ست پوڑہ پہنچے۔ وہاں ہرپال نام کا ایک بھیل رہتا تھا۔ وہ مسافروں کو لوٹا کرتا تھا، لیکن جو یاتری اسے بھجن کرتے ہوئے ملتے، انھیں

وہ چھوڑ دیتا تھا۔ اس نے گیانیشور وغیرہ کی بڑی محبت سے سیوا کی اور خود تیر کمان لے کر اُنھیں دھار نام کے گاؤں تک پہنچانے آیا۔ دھار سے چل کر گیانیشور اور ان کی منڈلی اجینی پہنچی۔ جہاں گیانیشور نے مشہور جیوتشی دیر منگل کا اُدھار کیا۔ اُس کی سمادھی پر انھوں نے شولنگ کی استھاپنا کی۔ یہ مقام شہر سے باہر سندیپن کے آشرم کے نزدیک اب بھی منگلیشور کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد گیانیشور پریاگ گئے۔ تربینی میں اشنان اور بھاردواج آشرم کے درشن کرکے کاشی پہنچے۔ کاشی میں اس وقت منی کینکا گھاٹ پر سری مُدگلاچاریہ نام کے ایک مہاتما ان دنوں بہت بڑا یگ کر رہے تھے۔ وہاں ایک سے ایک بڑے عالم جمع تھے۔ گیانیشور بھی وہاں پہنچے۔ یہ سوال اُٹھنے پر کہ سب سے پہلے کس کا پوجن کیا جائے۔ مُدگلاچاریہ نے ایک ہتھنی لاکر اس کی سونڈ میں پھولوں کا ہار دے دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ جس کے گلے میں ہتھنی ہار ڈال دے گی، سب سے پہلے اس کی پوجا کی جائے گی۔ ہتھنی نے وہ مالا گیانیشور کے گلے میں ڈال دی۔ اُنھی کا سب سے پہلے پوجن کیا گیا۔

گیانیشور جب دلی پہنچے، اس وقت یہاں سلطان جلال الدّین تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھے۔ گیانیشور اور ان کی منڈلی نے جب بھجن کیرتن کے ذریعہ عوام کو جگانا چاہا تب کٹّر مولویوں نے سُلطان سے شکایت کی۔ جلال الدّین غصہ کے عالم میں خود وہاں پہنچ گئے جہاں کیرتن ہو رہا تھا۔ لیکن گیانیشور کے اثر میں آکر اُنھوں نے شہر میں بھجن کیرتن کرنے اور گھومنے پھرنے کی پوری آزادی دے دی اور واپس چلے گئے۔

گیانیشور اپنے ساتھیوں سمیت گیا، ایودھیا، درندابن، دوارکا، گرنار وغیرہ تیرتھوں میں ہوتے ہوئے مارواڑ اور وہاں سے چل کر آخر میں پنڈھرپور آئے۔ یہاں سفر ختم ہو گیا۔ گیانیشور کے خاص ساتھی نام دیو نے اس موقعہ پر ایک بڑا بھوج دیا، جس میں بہت سے سنت شریک ہوئے۔

گیانیشور کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، چانگ دیو کی اصلاح۔ چانگ دیو یا چانگ دیشور

شو بھگت اور کامل شخص تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت سی زبانوں کے مہان پنڈت تھے۔ دُوسروں کے جسم میں داخل ہو سکتے تھے، پانی پر چل سکتے تھے اور معلّق ہو کر کتنے ہی کام کیا کرتے تھے۔ ان کا آشرم تاپتی ندی کے کنارے تھا۔ ان کے لئے یہ بھی مشہور تھا کہ وہ موت کو چودہ مرتبہ واپس بھیج چکے تھے۔ لیکن ان میں ایک بہت بڑی خامی تھی کہ وہ بہت متکبر تھے اور اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

جب انھوں نے گیانیشور کے کرشموں کی خبر سنی تو انھیں بڑی جلن ہوئی۔ اور گیانیشور کو نیچا دکھانے کی خواہش بیدار ہوئی۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے ایک شاگرد کو سادہ کاغذ دے کر گیانیشور کے پاس بھیجا۔ گیانیشور نے ان کے شاگرد کو دیکھتے ہی کہا —— کیا چانگ دیو نے میرے پاس سادہ کاغذ ہی بھیجا ہے؟

سب لوگ حیرت میں آ گئے۔ اس سادہ کاغذ کے جواب میں گیانیشور نے پینسٹھ بندوں پر مشتمل ایک خط چانگ دیو کو بھیجا، جس میں صرف علمِ روحانی کا تذکرہ تھا۔ لیکن چانگ دیو اسے ٹھیک سمجھ نہ سکے۔

اب چانگ دیو گیانیشور سے ملنے کے متمنی ہوئے۔ وہ اپنے ۱۴۰۰ شاگردوں کو لے کر گیانیشور سے ملنے چل پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ چانگ دیو شیر پر سوار تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک سانپ تھا جس سے وہ چابک کا کام لے رہے تھے۔ گیانیشور کو جب چانگ دیو کے آلندی پہنچنے کی خبر ملی تو وہ اپنے گھر کی دیوار پر بیٹھے نروت ناتھ سے بات چیت کر رہے تھے۔ نروت ناتھ نے گیانیشور سے کہا کہ ہمیں چانگ دیو جیسی عظیم شخصیت کا خیر مقدم ضرور کرنا چاہیئے۔ لیکن سواری کہاں سے آئے؟ کہتے ہیں گیانیشور کے حکم سے وہ دیوار جس پر دونوں بھائی بیٹھے تھے۔ چلنے لگی۔ چانگ دیو نے جب گیانیشور کو دیوار پر سوار ہو کر آتے دیکھا تو وہ بھوچکے رہ گئے۔ ان کا سارا غرور مٹ گیا اور وہ ان کے قدموں میں گر پڑے۔

اساڑھ اور کاتک کی ایکادشی کے دن پنڈھرپور میں پُرانے زمانے ہی سے ایک میلہ

لگتا تھا۔ ایک بار گیانیشور اپنے بہن بھائیوں سمیت وہاں گئے۔ بھاگوت کے اصولوں کے مُطابق انھوں نے چندر بھاگا ندی میں اشنان کیا۔ پُنڈریک بھگوان کے درشن کئے اور شری وِٹھّل رُکمنی کے درشن کرنے کے لئے مندر میں گئے۔ کہا جاتا ہے وہاں انھوں نے سب سنتوں کے سامنے بھگوان کی اُستتی کی اور من ہی من سمادھی گرہن کرکے جان دینے کی اجازت مانگی۔ ان کا من اب سنسار سے ایک دم اُچٹ گیا تھا۔

گیانیشور نے ۱۲۹۶ء میں اکیس سال کی مختصر سی عمر میں آلندی میں سمادھی لگاکر اپنا جسم چھوڑ دیا۔ نام دیو نے اس حادثہ کو ڈھائی سو چھندوں میں انتہائی دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ اب بھی ان کی سمادھی کے پاس آلندی میں اس دن ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔

خسرو

آج سے لگ بھگ ۷۰۰ سال سے بھی پہلے بھارت میں امیر خسرو نام کے ایک مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس وقت کی بول چال کی زبان میں بہت سے گیت، پہیلیاں، دوسخنے، کہہ مکرنیاں اور ڈھکوسلے وغیرہ لکھے ہیں جس کی وجہ سے ۷۰۰ برس سے زیادہ عرصہ گذر جانے پر بھی امیر خسرو کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اور اپنے اس کارنامے کی بدولت وہ آج بھی زندہ ہیں۔ امیر خسرو نے ہندی میں بھی لکھا۔ اُنھوں نے جیسی ہندی استعمال کی ہے، وہ ہماری آج کل کی ہندی کے بہت قریب ہے۔ اس طرح انھیں جدید ہندی کا پہلا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

خسرو کی پیدائش ۱۲۵۵ء میں ایٹا ضلع کے پٹیالی نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے والد تلاش معاش میں بلخ ہزارا سے یہاں آکر بس گئے تھے۔ تین بھائیوں میں خسرو سب سے چھوٹے تھے۔ وہ نو برس کے بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ان کے والد ۸۵ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے نانا نواب عماد الملک نے اُنھیں پالا۔

جب خسرو ۱۲ برس کے ہوئے تب ان کے لئے کسی کام کی تلاش ہونے لگی۔ اس وقت تک خسرو کے خاندان کے لوگ سپاہی پیشہ تھے۔ لیکن خسرو نے فوج میں بھرتی ہو کر تلوار اُٹھانے کے بجائے قلم پکڑنا زیادہ اچھا سمجھا۔ شروع ہی سے ان کا دل شاعری کرنے میں زیادہ لگتا تھا۔ سبھاؤ سے وہ بڑے نیک تھے۔ اُنھوں نے اپنا سارا دھیان لکھنے پڑھنے میں لگایا۔

اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں — میں ۱۲ برس کی عمر میں ہی شاعری کرنے

لگا۔ لیکن مجھے کوئی اُستاد نہیں ملا۔ میں پُرانے اور نئے شاعروں کی نظمیں پڑھتا اور اُنہی کے سہارے خود لکھنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح میرا قلم من مانے راستے پر بے لگام چلنے لگا۔

ان دنوں شاعر راج درباروں میں جاتے اور راجاؤں کو اپنا کلام سُنا کر انعام و اکرام پانے کی کوشش کرتے تھے۔ خسرو نے بھی یہی کیا۔ دُوسرے شاعروں کے مقابلے میں خسرو کو دربار میں بڑی جلدی کامیابی ملی۔ اور دولت عزّت بھی ملی۔ کیونکہ وہ عربی، فارسی اور ترکی سب ہی زبانوں میں شاعری کر سکتے تھے۔ دلی کے مُسلمان سلطان ترکی یا فارسی زبان کو آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

شروع شروع میں جب دلی کے دربار میں ان کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ تو خسرو کو کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوابوں اور سرداروں کی خدمت میں جاتے رہتے۔ دلی کے سلطان غیاث الدین بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد ان کی شاعری سے بہت خوش ہوا۔ وہ اُنھیں اتنا چاہتا تھا کہ اپنے پاس سے اُٹھنے نہ دیتا تھا۔ یہاں تک ۱۲۸۴ء میں مغلوں نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو شہزادہ ان سے لڑنے گیا اور خسرو کو بھی ساتھ لے گیا۔ اس لڑائی میں شہزادہ مارا گیا اور مغل خسرو کو پکڑ کر بلخ لے گئے۔ خسرو کے باپ دادا بلخ کے ہی رہنے والے تھے۔ دو برس بعد وہ بلخ سے لوٹے۔ ہندوستان پہونچ کر انھوں نے غیاث الدین کو اس کے بیٹے کی موت سے متعلق اپنی نظم سنائی۔ اس میں شہزادے کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا تھا۔ اسے سُن کر بلبن بے چین ہو گیا۔ اور اس کی طبیعت یکایک بہت خراب ہو گئی۔ تین دن بعد ہی وہ مر گیا۔

اب خسرو کو نئے سرپرست کی ضرورت تھی۔ دو سال تک وہ اودھ کے صوبیدار کے یہاں رہے۔ اس کے بعد وہ دلی لوٹ آئے اور بادشاہ کیقباد کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔

سن ۱۲۹۶ء میں سلطان جلال الدین کو مار کر اس کا بھتیجا علاؤ الدین خلجی دلی

کے تخت پر بیٹھا۔ علاؤ الدین بھی امیر خسرو سے خوش تھا۔ اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ خسرو کو پہلے کی طرح ساری سہولتیں ملتی رہیں۔ علاؤ الدین نے خسرو کو خسروئے شعرا کا خطاب دیا اور جلال الدین سے جو تنخواہ ملتی تھی اُسے جاری رکھا۔

۱۳۱۶ء میں قطب الدین مبارک شاہ سُلطان ہُوا۔ قطب الدین بھی شاعری کا شوقین تھا۔ وہ خسرو کی ایک نظم سے اتنا خوش ہُوا کہ انھیں ایک ہاتھی کے وزن کے برابر سونا دے ڈالا۔

خلجی خاندان کا خاتمہ ہونے کے بعد جب غیاث الدین تغلق گدی پر بیٹھا تب خسرو نے اُس کے نام پر "تغلق نامہ" نام کی ایک کتاب لکھی۔ یہ خسرو کی آخری کتاب کہی جاتی ہے

سب ملا کر خسرو نے ۹۹ کتابیں لکھیں۔ سبھی کتابیں فارسی اور عربی میں تھیں۔ ہندی اور اُردُو میں ان میں سے کچھ کے ترجمے ملتے ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں ـــ 'مثنوی شیریں فرہاد'، 'مثنوی لیلیٰ مجنوں' اور 'خالق باری'۔

خسرو اپنے زمانے میں فارسی کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے تھے لیکن ہندی بھی ان کے لئے ویسی ہی آسان تھی جیسی فارسی۔ کوئی کوئی نظم وہ ایسی بھی لکھتے تھے جس میں ایک مصرعہ فارسی کا ہوتا تھا تو دوسرا ہندی کا۔ جیسے ـــ

شبان ہجراں دراز چوں زلف روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس سے جان پڑتا ہے کہ اس وقت ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ہندی اور فارسی دونوں زبانیں یکساں طور سے سمجھتے تھے۔

خسرو نے اپنی آنکھوں سے غلام خاندان کا خاتمہ، خلجی خاندان کا عروج و زوال اور تغلق خاندان کا آغاز دیکھا تھا۔ ان کی زندگی کے دوران میں دلّی کے تخت پر ۱۱ سُلطان بیٹھے۔ اور ان میں ۵ سلطانوں کے درباروں میں اُنھیں عزّت کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل ہُوا۔

یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ خسرو کو جو عزت آج مل رہی ہے اس کی وجہ ان کے فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں۔ فارسی میں ان کے پانچ دیوان اور پانچ مثنویاں ہیں۔ بھارت میں اب تک فارسی کے جو شاعر ہوئے ہیں ان میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان متفرق اشعار کی وجہ سے لوگ اُنھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے' جو اُنھوں نے ہندی میں لکھے تھے۔

خالق باری سرجن ہار
واحد ایک بدا کرتار
مُوس چوہا گربہ : بلّی
سوزن ورشت۔ ہندی میں سوئی دھاگا

۶۰۰ برس پہلے ان کی لکھی کچھ پہیلیاں دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آج ہی لکھی گئی ہوں۔

کھڑا بھی لوٹا' پڑا بھی لوٹا
ہے بیٹھا اور کہے ہیں لوٹا (جواب — لوٹا)

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نہ مارا نہ خون کِیا (جواب — ناخون)

سامنے آئے کر دے دو
مارا جائے نہ زخمی ہو (جواب — آئینہ)

کہہ مکرنیاں ان کو کہتے تھے۔ جن میں پہیلی کا جواب آخری حصّے میں ہو۔ جیسے :۔

سوبھا سدا بڑھاون ہارا
آنکھوں تے چھن ہوت نہ نیارا
آئے پھر میرے منو رنجن

اے سکھی ساجن نہ سکھی آنجن

دوسخنے ان کو کہتے تھے جن میں دو سوالوں کا ایک جواب ہوتا تھا۔ جیسے ــــ

پنڈت پیاسا کیوں ؟

گدھا اُداسا کیوں ؟ (جواب ــ لوٹا نہ تھا)

ستار کیوں نہ باجا ؟

نار کیوں نہ نہائی ؟ (جواب ــ پردہ نہ تھا)

اب ایک ڈھکوسلا بھی سُنئے۔ ایک بار خسرو کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں پیاس لگی۔ وہ ایک کنوئیں پر پانی کے لئے رُکے۔ اس وقت کنوئیں پر چار عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اُنھوں نے خسرو کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک نے خسرو سے کہا ــ 'کھیر' پر کویتا سُناؤ تو پانی دوں گی۔ دوسری نے کہا ــ 'چرخہ'۔ تیسری نے 'کُتّا' اور چوتھی نے 'ڈھول' پر کویتا سُنانے کو کہا۔ خسرو نے ایک ہی بند میں چاروں کو مطمئن کر دیا۔ وہ بولے ــــ

کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا جلا
آیا کُتّا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی پلا

خسرو اچھے سنگیت کار بھی تھے۔ اُنھوں نے کئی راگ راگنیاں بھی نکالی تھیں۔ امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ اُنھیں ایرانی موسیقی پر بھی ایسا ہی عبور حاصل تھا اور دونوں کے ملاپ سے اُنھوں نے ایک تیسری چیز نکالی جس سے موسیقی کے فن میں جان پڑ گئی اور ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔ بعض بھارتی راگوں میں اُنھوں نے ایرانی راگ ملا کر نئے راگ نکالے جن میں سے کچھ کا ذکر نیچے کیا گیا ہے۔

ایمن ــــ بھارتی راگ ہنڈول اور ایرانی راگ نیریز کا امتزاج۔

اُشاک ــــ ہندوستانی راگ، سارنگ، اور بسنت اور ایرانی راگ نوا کو ملانا۔
موافق ــــ ہندوستانی راگ توڑی و مالری اور ایرانی راگ درگا حُسینی کو ملانا۔
جیلف ــــ بھارتی راگ کھٹ راگ میں ایرانی راگ شہناز کو ملانا۔
فرغنہ ــــ (فرغانہ) بھارتیہ راگ کنگلی اور گورا میں ایرانی فرغانہ کو ملانا۔
سراپردہ ــــ (سرپردہ) بھارتیہ راگ سارنگ بلاول اور ایرانی راگ راست کو ملانا۔
باخرز ــــ بھارتیہ راگ دیس کار میں ایک ایرانی راگ ملانا۔
فرودوست یا پہردوست (فرودست) ــــ بھارتیہ راگ کانہڑا گوری پوڑی اور ایک ایرانی راگ کو ملانا۔

امیر خسرو نے سنگیت کے پُرانے طریقوں میں جو کاٹ چھانٹ کی اور پرانی روائیتوں کو توڑ کر جو نئے راستے اپنائے اس کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُسے عام طور سراہا گیا۔ پُرانے راگوں کے شیدائیوں نے ان نئے راگوں کو نہیں اپنایا۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اوپر جن راگوں کا ذکر کیا گیا ہے اور جنھیں خسرو نے بھارتیہ اور ایرانی راگوں کو ملا کر نکالا تھا ان میں سے اب صرف تھوڑے سے ہی بچ رہے ہیں۔ باقی کے ناموں سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ستار امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ستار امیر خسرو کی اپنی ایجاد نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ دسویں صدی میں یا اس سے کچھ پہلے ایشیائے کوچک، ایران، آرمینیا اور ترکستان میں ستار سے ملتا جلتا ایک ساز تھا جس کا نام زیتھر یا گٹار تھا۔ لیکن یہ ساز بھی مصر کے ایک پُرانے ساز 'ستھارا' کی شکل کا تھا۔

ستار سے ملتی جلتی شکل کے جتنے ساز مغرب اور مشرق میں استعمال ہوتے

تھے ان میں صرف چار تار ہوتے تھے۔ ممکن ہے امیر خسرو نے تین تار اور بڑھا دیئے ہوں اور اس ساز کا نام ستار مشہور ہو گیا ہو۔ ستار بجاتے وقت خاص آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔۔۔ 'دا'، 'را'، 'در'۔ جب تاروں کو چھیڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہیں تب 'دا' کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب دوسری طرف لے جاتے ہیں تب 'را' کی آواز نکلتی ہے۔ لیکن اس لانے اور لے جانے کے بیچ ہی میں 'در' کی ایک اور آواز نکل آتی ہے۔

مختصراً امیر خسرو کی عظمت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس وقت ہمارے ملک میں ہندوستان اور مسلمان دیشوں کی تہذیبوں کا ملاپ ہو رہا تھا اس وقت امیر خسرو نے ایک بہت بڑا کام کیا۔ جس نے سنگیت اور ادب کے میدان میں دونوں تہذیبوں کے ملاپ کو بہت زیادہ آگے بڑھایا۔ بھارت کو خسرو کی یہ بہت بڑی دین ہے۔

خسرو مذہبی خیالات کے آدمی تھے۔ وہ اپنے پیر نظام الدین اولیا کی شان میں جو کچھ کہتے تھے اُس کا بہت جز ہوتا تھا۔ اسی لئے قوالی وغیرہ جن میں مذہبی رنگ بھی ہوتا ہے عوام میں بہت مقبول ہوئی اور آج بھی انھیں مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے کچھ گیت بھی بڑے مشہور ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے گیت دلی کے آس پاس کی عورتیں آج بھی گاتی ہیں۔ اس گیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خسرو کا لکھا ہوا ہے۔۔۔

اماں میرے بابا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ خسرو اپنے مرشد نظام الدین اولیا کو بہت زیادہ مانتے تھے۔ ۱۳۲۴ء میں حضرت نظام الدین اولیا کا وصال ہو گیا۔ خسرو اس وقت دلی

سے باہر تھے۔ یہ خبر سُن کر وہ فوراً دلی آئے۔ نظام الدین کے مزار کے پاس جا کر انھوں نے یہ دوہا پڑھا۔

گوری سوئے سیج پر مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوں دیس

اس کے بعد تو خسرو گھر بار چھوڑ کر اپنے پیر و مرشد کے مزار کے پاس جا بیٹھے اور اپنا سب کچھ لُٹا ڈالا۔ اسی سال ان کی بھی موت ہو گئی اور اپنے مرشد کی قبر کے نزدیک ہی دفنائے گئے۔ آج بھی ان کا عرس ہر سال منایا جاتا ہے۔

ودیارن

ودیارن چودھویں صدی کی عظیم شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے مذہبی اور سیاسی دونوں میدانوں میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی اہمیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس وقت کے سیاسی اور مذہبی ماحول پر روشنی ڈالی جائے۔

۷۱۲ء میں عربوں نے سندھ کو جیتا لیکن مختلف راجپوت اقوام کی بہادری نے انھیں اور آگے نہ بڑھنے دیا۔ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ حملہ کا دوسرا ریلا آیا۔ اور اس بار پنجاب ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس پر بھی بھارتی نہ جاگے اور ان کے باہمی جھگڑے چلتے رہے۔ گجرات کے چالکیوں نے اجمیر کے چوہانوں پر حملہ کیا۔ ادھر اجمیر کے چوہان مہاراجہ دھیراج پرتھوی راج نے اپنی حرکتوں سے مہوبا کے چندیلوں اور قنوج کے گاہڑوالوں سے دشمنی کرلی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ۱۱۹۲ء کے لگ بھگ دوبارہ جب غیر ملکی حملوں کا ریلا آیا تو بھارتی راجہ اس کا سامنا نہ کرسکے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں مسلمان بھارت کے مغربی گوشے سے مشرق تک پھیل گئے۔

ہندوستان کی جنوبی ریاستیں شمالی حصہ کی اس تباہی سے کچھ سبق سیکھ سکتی تھیں لیکن وندھ، ست پڑہ اور گہن پربتوں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر وہ بھی شمالی ریاستوں کے راجاؤں کی طرح آپس ہی میں لڑتے رہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے سیاسی زوال کے کوئی سو سال بعد جیسے تاریخ کا مزاج ہی بدل گیا۔

۱۲۹۴ء میں جب دہلی میں جلال الدین خلجی کی حکومت تھی اس وقت ان کے بھتیجے نے اچانک دیوگری کے یادو راج پر حملہ کردیا۔ لیکن وہاں کا راجہ رام چندر یادو

اس غیر متوقع مقیبت کا مقابلہ نہ کرسکا اور اس نے بہت مال و زر دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔

لیکن لگ بھگ بارہ سال میں شمالی بھارت کے مختلف علاقے جیتنے کے بعد ۱۳۰۷ء میں علاؤ الدین خلجی نے اپنی فوجیں جنوب کی طرف بھیجیں اور اس بار دیوگری کے راجہ نے دلّی کی ماتحتی قبول کرلی۔ وارنگل کے راجہ الدیر تاپ دوئم کو بھی خراج دینا پڑا۔

دوار سمدر کا راجہ ویر بلال سوئم بھی مسلمانوں سے ہار گیا۔ دوسری طرف پانڈ راج کے لئے "سندر پانڈ" اور "ویر پانڈ" ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار تھے۔ علاؤ الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور سندر پانڈ کو مدد دینے کے بہانے مدورا سے ہوتا ہوا بھارت کے جنوبی سرے تک پہونچ گیا۔

علاؤ الدین خلجی کے جانشین مبارک نے دیوگری کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ پھر ۱۳۲۳ء میں غیاث الدین تغلق نے وارنگل کو جیتا۔ پانچ سال بعد ۱۳۲۸ء میں مسلمانوں نے مدورا بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔ ۱۳۳۴ء میں وہاں ایک اسلامی سلطنت بھی قائم ہوئی اس طرح ۱۳۴۰ء تک بھارت کے تمام علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ بھارتی اپنا راج کھو بیٹھے۔ ان کی تہذیب کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔ مندروں کی جگہ مسجدیں لے رہی تھیں۔

ایسے حالات میں جنوب کی سرزمین کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بھارت کی تہذیب اور سیاست کو بیرونی اثرات سے بچا سکے۔ ان میں سے کسی ایک کی حفاظت کافی نہ تھی کیونکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جس مذہب میں اپنے تمدن کے لئے پیار نہ ہو وہ اپنے سیاسی مقام کے لئے بھی نہیں لڑ سکتا اور جو ملک سیاسی اعتبار سے کمزور ہو اس کے سماج اور تہذیب کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ودیارن نے دونوں پہلوؤں کو مدِّ نظر

رکھا اور کام میں لگ گئے۔

ودیارن کا گھریلو نام مادھو تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی تھے ساٹن اور بھوگ ناتھ۔ پتا کا نام مائن اور ماتا کا نام شریمتی تھا۔ ان کے پتا غالباً وجے نگر راج کے بانی ہری ہر اور بک وغیرہ کے "گل گرو" تھے۔ یوں مادھو نے اپنے پتا سے بھی کچھ تعلیم حاصل کی ہوگی۔ لیکن انھوں نے خاص طور سے ودیاتیرتھ' بھارتی تیرتھ' اور سری کنٹھ کو اپنا اُستاد تصور کیا ہے۔ ودیاتیرتھ "شرنگیری" مٹھ کے ودیا چاریہ تھے۔ بھارتی تیرتھ "ویدانت کے ہی اپدیشک تھے۔" سری کنٹھ ودیارن اور بھوگ ناتھ کے گرو تھے۔ بہت ممکن ہے کہ شعر و ادب کی تعلیم انھوں نے سری کنٹھ سے پائی ہو۔

بالک مادھو نے اپنے ملک کو بُری طرح تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت لوگ "چدمبرم" کے مقدس تیرتھ کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مندروں کے "گربھ گرہوں" اور منڈپوں میں گھاس اُگ آئی تھی۔ دیودایوں اور مندروں پر جزیہ لگ گیا تھا۔ بہت سے مندر یا تو خود گر گئے تھے یا گرا دئے گئے تھے۔

مادھو نے ایک ہندو راج میں جنم لیا تھا۔ دوار سمندر کے راجہ ویر بلال مدبر اور سمجھدار تھے۔ مائن اور مادھو ان بھائیوں کے گرو تھے۔ جنوبی بھارت کی یہ تباہی مادھو سے نہ دیکھی گئی۔ انھوں نے ہر قیمت پر اس کی حفاظت کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے بھائیوں اور شاگردوں کو بھی اس کام کے لئے سختی سے آمادہ کیا۔

حالات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سنگم راج کے بیٹے ہری ہر اول بک کیمپ وغیرہ نے ۱۳۳۶ء میں مادھو اچاریہ (ودیارن) کی نگرانی میں وجے نگر راج کی بنیاد ڈالی۔ ممکن ہے کہ مادھو اچاریہ کا کام انتہائی اہم رہا ہو۔ ان کے احکامات پر عمل کر کے سنگم راج کے بیٹوں نے جنوبی بھارت کے سماج میں دوبارہ رُوح پھونکی۔ انھوں نے محمد تغلق کے کئی سپہ سالاروں کو بہت سی جگہوں پر شکست دی۔ اور آخر میں وجے نگر

کے عظیم سامراج کی نیو ڈالی۔ یہ دیکھ کر ہندوؤں میں جوش کی ایک نئی لہر آگئی۔ اس راج کے قائم ہونے کی اطلاع جب جبجی پہونچی تو وہاں کے راجہ نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ انھیں ہرایا اور سری رنگم ناتھ کی دوبارہ سجاوٹ کی۔ بک رائے کے بہادر بیٹے کمپن نے پرانے مندروں کو پھر بنوایا اور ان میں پوجا شروع کی۔ سائن نے سنگم دوئم کو تعلیم دینے کے علاوہ بہت سی جنگوں میں فوجی کام بھی کیا۔

ایسے اہم سیاسی کاموں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ مادھواچاریہ نے ہندو دھرم کے اصولوں کو عوام کے سامنے رکھنے کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "پراشر مادھوی" میں انھوں نے ہندو دھرم کے بعض اصولوں کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ پنڈتوں میں اس کتاب کی اتنی ہی قدر ہے۔ جتنی "منوسمرتی" کی ہے۔ یہ کتاب غالباً انھوں نے ۱۳۵۴ء کے لگ بھگ لکھی ہے۔ "جیون مکتی" "وویک پنچ دشی اور "جیمنی نیائے مالا" ان کے دوسرے مشہور گرنتھ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ویدوں پر تشریح لکھنے میں بھی انھوں نے مدد کی تھی۔

۱۳۷۷ء کے آس پاس مادھواچاریہ ودیارن کے نام سے سنیاسی ہو گئے۔ لیکن ہندو دھرم کی حفاظت کے معاملے میں ان کا رویہ ویسا ہی رہا۔ کہتے ہیں کہ ودیارن نے ویشنو دھرم کے مہان گرو "ویدانت دیشک" کو بھی اس کام میں لگنے کی کوشش کی۔

۱۳۸۶ء میں وجے نگر کے راجہ ہری ہر دوئم نے ودیارن کی موجودگی میں کچھ عالموں کو ویدوں پر تشریح لکھنے کے سلسلے میں انعام واکرام دیا۔ ودیارن کے لئے عوام کے دلوں میں کتنی جگہ تھی یہ کئی باتوں سے ثابت ہے۔ ۱۳۸۰ء میں ہری ہر دوئم کے بھانجے نے ودیارن کے شاگرد ودیا بھوشن دیکھشت کو ایک "اگر ہار" دکھشنا میں دیا اور اس کا نام ودیارن کے نام پر رکھا۔ ہری ہر نے ودیارن کے نام پر ہمپی میں ایک مندر بنوایا۔

ودیارن حقیقت میں "یگ نیتا" تھے۔ ان میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ سچا نیتا تو وہی ہے جو خود بھی کام کرے اور دوسروں میں بھی قوت عمل پیدا کرے۔ اِس

حیثیت سے وہ یارن بے مثال ہیں۔ یہ اُنہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جنوبی ہند میں بھارتی تہذیب بچ گئی۔ سنسکرت ادب اور فلسفے میں نئی زندگی آئی۔
شنکراچاریہ کے بعد ویدانت کے اصول کی اس قدر آسان اور عمدہ تشریح بہت کم عالموں نے کی ہے۔

شنکر دیو

شنکر دیو علی پوکھری نام کے گاؤں میں ۱۴۴۹ء میں دسہرے کے دن پیدا ہوئے تھے۔ شنکر دیو کی ماں ستیہ سندھا دیوی اور پتا کسمبر بھوئیاں ان کے بچپن میں ہی چل بسے تھے۔ کسمبر 'شرومنی بھوئیاں' (بڑے جاگیردار) تھے۔ ان کی موت کے بعد جاگیر کا انتظام شنکر کے دادا جینت نے سنبھالا۔ شنکر کی پرورش ان کی دادی کھیرسُتی کرنے لگیں۔ شنکر کے بارہ برس کھیل کود میں ہی بیت گئے۔ شنکر اپنے ساتھیوں کے گروہ بناکر جنگل جنگل پھرتے۔ وہ تیر کمان سے شکار کرتے چڑیاں پکڑتے، برہم پتر کے آر پار تیرتے اور دھما چوکڑی مچاتے۔ وہ بڑے شریر تھے اور بڑے نڈر بھی۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ ایک سوئے ہوئے ریچھ پر چڑھ بیٹھے تھے۔ ریچھ اُٹھا اور انھیں لے بھاگا مگر کسی طرح شنکر بچ گئے۔

پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیل کود میں کھانا پینا بھی بھولے رہتے۔ بُلانے پر بھی گھر نہ آتے۔ لوگ ڈھونڈتے پھرتے، وہ بھاگے پھرتے، پکڑے جاتے تو خوب پٹتے۔ پھر بھی شرارت سے باز نہ آتے۔ نہ کسی کی بات سُنتے۔ ایک دن دادی کھلانے بیٹھیں تو رو کر پوچھنے لگیں۔ سچ بتا بیٹے! تو پڑھتا کیوں نہیں؟

شنکر پسیج گئے۔ کہا — اچھا، اب سارے شاستر پڑھ ڈالوں گا۔

دادا انھیں چٹ سال میں بٹھا آئے۔ گرو جی کا نام تھا مہندر کندلی۔ اب شنکر پڑھائی میں جُٹ گئے۔ کھیل کود بھُول گئے۔ پانچ سال تک پڑھنے میں لگے رہے۔ پانچ سال بعد 'ویاکرن'، کاویہ اور دھرم شاستروں کے پنڈت بن کر گھر لوٹے۔

چٹ سال ہیں رہتے رہتے شنکر کچھ یوگ کا بھی عمل کرتے رہتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے بھاگوت (گیتا) میں انھیں اتنا لطف آنے لگا کہ یوگ سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اب ہر وقت بھاگوت لئے رہتے۔ پڑھتے، دُوسروں کو سمجھاتے۔ اُنھیں بھاگوت کی بھگتی میں اس طرح ڈوبا ہوا دیکھ کر بڑے بوڑھے مذاق اُڑاتے۔ "شنکر بیٹا۔ ہم سے تو اب کچھ ہونے سے رہا۔ ہم سب کے لئے تو ہی بیکنٹھ (جنّت) بنا دے۔"

شنکر سچ مچ بیکنٹھ بنانے میں لگ گئے۔ اُنھیں چتر کاری (مصوری) کی بھی کچھ مشق تھی۔ بڑے بڑے پردے لئے اور اُن پر تصویر بنانے لگے۔ انگرد ہرتال وغیرہ رنگوں سے سات پردوں پر سات سورگ بنائے۔ ساتوں میں سات بھگوان کا چتر بنایا۔ جہاں تہاں جھیلیں اور پھلواڑیاں بنائیں۔ جب چتر بن کر تیار ہوئے تو لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خبر پھیلی کہ شنکر نے جنّت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور راجیہ بھر کے لوگ اس جنّت کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ کیا بچّے، کیا بُوڑھے، کیا مرد کیا عورتیں سبھوں کا تانتا بندھ گیا۔ کبھی کبھی تو گاؤں میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ہوتی۔ لوگ تصویر کا مطلب سمجھنا چاہتے تھے۔ ہر ایک چتر کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتے تھے۔ بیچارے شنکر کو اُنھوں پھر لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا۔

آخر اُنھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ گاؤں کی بولی میں 'چِھم یاترا' نام ایک ناٹک لکھا۔ سکھا پڑھا کر اداکار تیار کئے۔ رام رام گورو کو سُوتر دھار (تعارف کنندہ) بنایا۔ اُنہی پردوں کو سجا کر اداکاری شروع ہوئی۔ شنکر بھیس بدل بدل کر ایک ساتھ کئی اداکاروں کے رُوپ میں اسٹیج پر آتے۔ باجے والوں کی کمی پڑ جاتی تو ایک ساتھ چھ چھ کھول (ڈھولک) بجاتے۔ ناچ کی باری آتی تو کود کر پھر اسٹیج پر پہونچ جاتے۔ ان کا ناٹک اتنا کامیاب ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ اداکاروں کے رشتہ دار بھی انھیں پہچان نہیں پاتے۔ سبھی کرداروں کے بارے میں لوگوں کو یہی محسوس ہوتا کہ یہ بھی شنکر ہی ہیں۔

چھپم یاترا شنکر کی دُوسری تصنیف تھی۔ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ ایک کھنڈ کادیہ لکھ چُکے تھے۔

اس کتاب میں ان کا پیغام بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ بھاگوت سے انھیں بے حد عقیدت تھی بلکہ اس کی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہب کے بارے میں جھگڑے بے کار ہیں۔ دھرم تو سیدھا سادا ہونا چاہیئے۔ انھوں نے ایشور کو حاصل کرنے کے لئے بھگتی (عبادت) کے راستے کو چُنا۔ یہی راستہ جنتا میں ایکتا لا سکتا تھا۔

شنکر کے اس دھرم نے لوگوں کے من میں وشواس پیدا کیا اور یہ احساس پیدا کیا کہ دُنیا میں سبھی برابر ہیں۔ سب کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ اس سے ذات پات کے بھید بھاؤ میں کمی آئی۔ فرد کو سماج میں سر اُٹھا کر اطمینان کے ساتھ رہنے کا سہارا ملا۔

جب شنکر اکیس برس کے تھے تب وہ کیرتن لکھنے لگے۔ ان میں بھگوت کی کتھائیں ہوتیں۔

آسان لفظوں، گیتوں اور کہانیوں کے ذریعے بھگتی، ایکتا، نیکی اور محبّت کا پیغام ہی ان کیرتنوں کی خصوصیت ہے سارے آسام کے نام گھروں (کیرتن گھروں) میں اُنھیں آج بھی لوگ گاتے ہیں۔

گھر والوں نے جب دیکھا کہ وہ تو دن رات دھرم کرم میں ہی لگے رہتے ہیں تب اُنھوں نے شنکر دیو کا بیاہ سوریہ وتی دیوی سے کر دیا۔ ساتھ ہی بھوئیاں گری کی ذمّہ داری بھی ان کے کندھے پر ڈال دی۔ شنکر نے دونوں ذمّہ داریاں سنبھال لیں۔ پھر بھی وہ اپنا زیادہ وقت "نرگن کرشن کے گُن" گانے اور دھرم کی باتیں میں ہی گذارتے تھے۔

ذات پات کا بھُوت ان دنوں سب پر سوار تھا۔ بڑا عجیب حال تھا۔ برہمن اور بھوئیاں کائستھ اُونچی ذات کے مانے جاتے تھے، باقی لوگ نیچی ذات کے تھے۔ ان ذاتوں میں بھی

کوئی فرقہ اونچا اور کوئی نیچا سمجھا جاتا تھا۔ ملاح سب سے نیچی ذات کے سمجھے جاتے تھے۔ شنکر کو یہ سب بھید بھاؤ پسند نہیں تھا۔ اس لیے اُنھوں نے ذات پات کی بندشوں کی سخت مخالفت کی۔

بردوا کے پاس ایک نالا تھا۔ چوماسے میں جب اس نالے میں باڑھ آتی تو وہ کھیتوں کی فصل کو بہالے جاتی تھی۔ رعایا نے ان سے درخواست کی کہ اس پر بند بنوا دیا جائے۔ شنکر نے گاؤں کے سبھی لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اور بند باندھنے میں لگ گئے۔ لیکن بند ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ آخر میں شنکر نے کہا —— مٹی کا پہلا ڈھیلا اگر کوئی ستی ڈالے تو بند نہ ٹوٹے گا۔

ستی کی تلاش شروع ہوئی۔ برہمن اور بھوٹیاں ذات کی عورتیں بغلیں جھانکنے لگیں آخر میں کیوٹ ذات کی ایک دوشیزہ رادھیکا آگے آئی۔ اور بند ٹِک گیا۔ اونچی ذات والوں کا گھمنڈ ٹوٹ گیا۔ آج تک یہ نالہ سنتی نالہ (شانتی نالہ) کہلاتا ہے۔

شنکر لگ بھگ تیس برس کے ہوئے تو ان کے یہاں ایک بیٹی ہوئی۔ اُنھوں نے اس کا نام رکھا منو۔ منو کے جنم کے نو مہینے بعد ہی شنکر کی پتنی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے نو برس بعد شنکر تیرتھ کرنے نکلے۔ ان دنوں تیرتھ کا مطلب تھا سارے دیش میں پیدل بھٹکنا ریل نہ تھی۔ چاروں طرف جنگل تھے۔ وہ بارہ سال ادھر اُدھر گھومے۔ ہر جگہ لوگ ان کے اُپدیش سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس یاترا میں اُنھوں نے کتنے ہی شاگرد بنائے۔ پھر وہ جب بردوا لوٹے تو رشتہ داروں اور اپنی پرجا کے بہت زور ڈالنے پر دوسری شادی کرلی۔

اسی دوران بھوئیوں اور کچھاریوں میں ان بن ہوئی۔ کسمبر کے بعد جاگیر کا انتظام ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کچھاری چڑھ آئے تھے۔ شنکر نے سامنا کرنا ٹھیک نہ سمجھا کیونکہ بے کار جانیں ضائع ہوتیں۔ انھوں نے بردوا چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

یہ واقعہ ۱۵۱۶ء کا ہے۔ شنکر دیو اڑسٹھ سال کے ہوچکے تھے۔ اب تک وہ اپنے

'کیرتن گھوش" نام کی کتاب کے آٹھ ابواب کے علاوہ 'بھگتی پردیپ' 'رکمنی ہرن کا دیہ'
'بڑگیت' بھاگوت کے چھٹے (اجامل کی کہانی) اور آٹھویں سکند (گج گرہ امرت منتھن
ہرموہن) اور گن مالا کے کچھ ابواب لکھ چکے تھے۔

بھوٹیاں لوگوں کو بردوا سے بھاگ کر بھی چین نہیں ملا۔ برہم پتر ندی کے پاس جہاں
ان لوگوں نے پناہ لی تھی۔ بھوٹیا اکثر حملے کیا کرتے تھے۔ بھوٹیاں لوگوں کا رہنا دشوار
ہو گیا تھا۔ شنکر اپنے ساتھیوں سمیت ماجلی (ٹاپو) چلے گئے۔ یہاں وہ چودہ برس رہے
یہیں انھیں اپنے کئی خاص چیلے ملے۔ انہیں میں مادھو دیو بھی تھے جو شاستر کے
معنی و مطالب کے بارے میں ان سے بحث کرنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن شنکر کو دیکھتے ہی سارا
گھمنڈ بھول گئے اور ان کے مرید بن گئے۔ جیون بھر چھاؤں کی طرح وہ شنکر کے ساتھ رہے
انھوں نے شنکر کے مت کو پھیلایا۔

شنکر دیو اپنے شاگردوں کے ساتھ پاٹ باؤسی میں کیرتن کیا کرتے تھے۔ اس لئے
ان کے بھگت پاٹ باؤسی کو دوسرا ورندابن مانتے ہیں۔ یہاں چندوا (چاند شاہ)
نام کے ایک مسلمان اور گارو قبیلے کے گووند نام کے سردار آکر ان کے شاگرد ہوئے۔ ان
دونوں میں ذات پات اور چھوت چھات مٹانے اور آسام کے لوگوں کو ایک کرنے کے سلسلے میں
بہت بڑا کام کیا۔ شنکر جہاں کہیں جاتے نام گھر (کیرتن کرنے کی جگہ) کھلواتے۔ بعد میں
نام گھر ہی دیہاتوں کے انتظامی اور چھوٹے موٹے تہذیبی مرکز بنے۔

وہ پاٹ باؤسی سے ہی ستانوے سال کی عمر میں دوسری تیرتھ یاترا پر نکلے۔
اس بار وہ گنگا، نودویپ، کبیر مٹھ، ستری کھشیتر اور پوری کی یاترا کر آئے۔
جب شنکر لوٹ کر آئے تو انھوں نے پورے آسام میں کیرتنوں کی دھوم مچا

دی۔ ان کا اثر پہلے ہی سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ ان کے مخالف گھبرائے اور یہ افواہ پھیلائی کہ شنکر دیو ہندو دھرم کو مٹانا چاہتے ہیں۔ کوچ راجہ نے شنکر کی گرفتاری کا پروانہ جاری کر دیا۔ راجہ کے بھائی دیوان چلا رائے شنکر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے شنکر کو چپکے سے بلوا لیا۔ وہ دربار میں پیش ہوئے۔ پنڈت لوگ شنکر سے شاستر ارتھ کرنے کے لئے دوڑ پڑے۔ مگر شنکر نے سبھوں کو ہرا دیا۔ اس سے ان کی عزت اور بڑھ گئی۔ وہیں انھوں نے اپنی "گن مالا" نام کی کتاب مکمل کر کے راجہ کو بھینٹ کی۔ راجہ ان کا کمال دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے انعام میں شنکر کو قیمتی کپڑے دئے۔

کہتے ہیں کہ ۱۲۰ برس کی عمر میں ۱۵۶۸ء میں بھادوں شدی دوج کو کیرتن کرتے کرتے مہا پرش شنکر دیو نے سفر آخرت کیا۔

شنکر نے آسام پردیش کے سماج ساہتیہ (ادب) اور سنسکرتی (تہذیب) میں ایک نئی بیداری لائی۔ ان ہی کے اثر سے وہاں ساہتیہ (ادب) سنگیت (موسیقی) نرتیہ (رقص)، چتر کاری (مصوری) وغیرہ کی نت نئی تصنیفیں ہونے لگیں۔

شنکر کی دنیاوی زندگی ایک آدرش تھی۔ ان کا خاندان بڑا تھا۔ اپنے بچوں کے لئے انھیں معلم رکھ چھوڑے تھے۔ کھیتی ذکر کرتے تھے۔ مہمان اور مدد مانگنے والوں سے ان کا گھر ہمیشہ بھرا پڑا رہتا تھا۔ ان کی فیاضی کی کوئی حد نہ تھی۔

شنکر نے عوام کو پروہتوں کے پنجے سے چھڑایا' اور ذات پات کی بنیادیں ہلا دیں۔ شنکر نے آسام کے لوگوں میں ذات پات کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے میں بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے۔ ویشنو سادھوؤں نے ان کی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ لیکن شنکر ان کے بغیر بھی امر ہیں۔

نرسنگھ مہتہ

صبح ہوتے ہی گجرات کا گھر گھر پربھاتیوں اور بھگتی کے پدوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ خاص طور سے بھگت نرسنگھ کے لکھے ہوئے پدوں کی گجرات میں بہت دھوم ہے۔ بھگت نرسنگھ گجراتی زبان کے کوی ملنے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے پد اچھے اور اونچے خیالوں سے بھرپور ہیں۔ بھگتی میں ڈوب کر اُنھوں نے جو پد لکھے وہ اپنی آسانی اور اثر انگریزی کی وجہ سے ہر دل عزیز ہوئے۔ وہ خود بڑے اچھے گویے تھے۔ اپنے پدوں کی رچنا اُنھوں نے مختلف راگوں میں کی۔

اُن کا لکھا ہوا یہ بھجن جس کے شروع کے دو مصرعے نیچے لکھے ہوئے ہیں۔ مہاتما گاندھی بڑے پیار سے گاتے تھے۔

ویشنو جن تو تے نے کہئے جے پیڑ پرائی جانے رے
پر دُکھے اُپکار کرے تو ئے من ابھمان نہ آنے رے

سوراشٹر کے تلاجہ گاؤں میں نرسنگھ کا جنم ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا زمانہ ۱۴۱۴ء سے ۱۴۸۰ء تک مانا جاتا ہے۔ نرسنگھ ناگر برہمن ذات کے تھے۔ ان کے پتا کا نام کرشن داس اور ماتا کا نام دیا کور تھا۔ نرسنگھ کے بچپنے ہی میں اُن کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں اُن کی پرورش اپنے چچا کے یہاں ہوئی۔

نرسنگھ بچپن ہی سے سنت منڈلیوں کے ساتھ گھوما کرتے تھے اور اپنا زیادہ وقت مندروں میں گذارتے تھے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر اُن کی شادی کر دی گئی۔ ان کی پتنی کا نام مانک بائی تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے چچیرے بھائی کے گھر رہا کرتے تھے۔ نرسنگھ کو گھریلو کاموں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس لئے اکثر ان کی بھابی اُنھیں برا بھلا کہتی تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک دن نرسنگھ رنج ہو کر شوجی کے مندر چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے سات دن تپ کیا۔ اس پر شوجی خوش ہو کر ظاہر ہوئے اور انھوں نے کہا۔ "تم کرشن کی بھگتی کرنا اُن کے گُن گانا۔"

اُسی دن سے نرسنگھ نے جوناگڑھ میں الگ گھر لے لیا اور کرشن کی بھگتی میں لگ گئے۔ آج بھی جوناگڑھ میں ناگر واڑا نام کی گلی میں ان کے مکان کی جگہ ایک چبوترہ ہے، اور وہ نرسنگھ مہتہ کا چبوترہ کہلاتا ہے۔

پُرانے زمانے میں لوگ ہری جنوں کو چھونا بُرا سمجھتے تھے۔ لیکن نرسنگھ ہری جنوں کی بستیوں میں جا کر سب کے ساتھ بیٹھ کر پربھو کیرتن کرتے تھے۔ وہ چھوت چھات نہیں مانتے تھے۔ اس لئے دُوسرے ناگر برہمن ان کی ہنسی اُڑاتے تھے اور انھیں برادری سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن نرسنگھ اپنے آدرش سے نہیں ہٹے۔ وہ تو ہر جان دار کو ایشور کا رُوپ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں کرشن کی بھگتی اور ان کا ذکر ہو گا وہاں میں بے فکری کے ساتھ بیٹھوں گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نرسنگھ اپنے وقت کے مانے ہوئے سماج سُدھارک تھے حالانکہ ان کو ان باتوں پر سماج کی سختیوں کا نشانہ بننا پڑا لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔

نرسنگھ نے بھگتی کے بہت سے پد لکھے ہیں۔ وہ کرشن کے پکے معتقد تھے۔ بھگتوں کا عقیدہ ہے کہ جیسے بھری محفل میں دروپدی کی لاج بچ گئی اور میرا بائی کا زہر کا پیالا امرت بن گیا۔ اسی طرح کے حادثات نرسنگھ کے ساتھ بھی پیش آئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کچھ بھگتوں کو یاترا کے لئے دوارکا جانا تھا اور وہ لوگ کسی ایسے ساہوکار سے ہُنڈی لکھوانا چاہتے تھے جس کی وہاں بھی ساکھ ہو۔ کچھ پڑوسیوں نے مذاقاً نرسنگھ مہتہ کا گھر بتا دیا کہ وہاں جاؤ ان کی ہنڈی بہت جگہ چلتی ہے۔ بھگت وہاں پہونچے اور اُنھوں نے نرسنگھ سے گذارش کی کہ آپ جتنے پیسے چاہیں لے لیں لیکن دوارکا میں کسی کے نام ہُنڈی لکھ دیں۔

نرسنگھ نے سوچا بھگت لوگ ہیں ان کا کام ضرور کرنا چاہیئے۔ لیکن دوارکا میں ان کا کوئی شناسا نہ تھا۔ کچھ سوچ کر انھوں نے دوارکا دھیش شامل شاہ (سری کرشن کا ایک نام) سیٹھ کے نام پر سات سو روپیہ کی ہنڈی لکھ دی۔

بھگت لوگ ہنڈی لکھوا کر دوارکا میں پہنچے۔ نہا دھو کر کھا پی کر سیٹھ شامل شاہ کی تلاش میں نکلے۔ بہت تلاش کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یہاں تو شامل شاہ نام کے کوئی سیٹھ نہیں رہتے۔ بھگت گھبرا گئے اور جوناگڑھ کی طرف واپس جانے لگے۔ کہتے ہیں کہ بھگوان کرشن راستے میں شامل شاہ بن کر بھگتوں کو ملے اور بتایا کہ میں ہی شامل شاہ سیٹھ ہوں یہ اپنی ہنڈی کا دام لیجئے اور کوئی کام ہمارے لائق ہو تو بتائیے۔

بھگت لوگ تو ہنڈی کے پیسے ہی لے کر خوش ہو گئے۔ لیکن جب نرسنگھ کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ شوق سے بھگوان کی بھگتی میں مصروف ہو گئے۔

نرسنگھ کے دو بچے تھے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کا نام کنور بائی اور لڑکے کا نام شامل داس تھا۔ نرسنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ شادی کے چار سال بعد لڑکی کے گھر بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ گجرات میں ایسے موقعوں پر نانا کے گھر سے تحائف بھیجنے کی رسم ہے۔ اور اس رسم کو گجراتی میں مامیرو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لڑکی کے سسرال والوں نے نرسنگھ کی غریبی کا مذاق اڑانے کی غرض سے چیزوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بنا کر ان کو بھیج دی۔

نرسنگھ کے پاس تو ایک کوڑی بھی دینے کو نہیں تھی لیکن ان کو بھگوان شامل (کرشن) پر پورا یقین تھا کہ وہ ضرور میرا کام کر دیں گے۔ اس موقعہ پر نرسنگھ سادھو منڈلی کو ساتھ لے کر اپنی لڑکی کے گاؤں پہنچے۔ لڑکی اپنے باپ سے مل کر خوب روئی اور کہنے لگی۔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں تھے تو اس موقعہ پر آپ یہاں کیوں چلے آئے؟

نرسنگھ نے لڑکی کو سمجھایا اور کہا کہ جو جو چیزیں چاہئیں۔ وہ اپنی ساس سے لکھوا کر لے آؤ۔

ساس نے یہ سُن کر ضرورت سے دس گنا زیادہ چیزوں کی فہرست بنوائی ۔ سینکڑوں جوڑ کپڑے قسم قسم کی ساڑھیاں اور سامان لکھوا دیا اور ہنسی ہنسی میں یہ بھی لکھوا دیا کہ اگر کچھ نہ بن سکے تو دو بڑے بڑے پتھر ہی لیتے آنا۔ غریب بھکاری باپ سے اور کیا اُمید کی جا سکتی تھی؟

کہتے ہیں، اس نئی آفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے نرسنگھ تو بھگوان کے کیرتن میں مصروف ہو گئے، اُدھر بھگت کی پکار سُن کر بھگت میں سمائے ہوئے بھگوان کرشن سیٹھ شامل شاہ بن کر ٹھیک وقت پر تمام سامان لئے ہوئے لڑکی کے گھر پہنچ گئے ۔ جو جو چیزیں لکھوائی گئی تھیں وہ سب پہنچا دیں اور جو دو پتھر لکھے ہوئے تھے جب وہ ساس کو دینے لگے تو بھگوان کی لیلا سے وہ بھی سونا بن گئے۔

ایک اور کہانی نرسنگھ سے متعلق رائج ہے ۔ نرسنگھ کے بیٹے شامل داس کا بیاہ بھی بھگوان کی کرپا سے ہوا تھا۔ نرسنگھ نے اس کے بارے میں بھی اپنے پدوں میں تفصیل سے لکھا ہے ۔

جب شامل داس بارہ سال کا ہوا تو اس کی ماں نے سوچا کہ لڑکا اب سیانا ہو گیا ہے اس کی شادی ہونی چاہیئے ۔ لیکن پیسوں کے بغیر شادی ہونا ناممکن تھی ۔ لیکن نرسنگھ کو یقین تھا کہ بھگوان کرشن شادی میں ضرور شریک ہوں گے اور یہ کام انتہائی آرام سے انجام پذیر ہو گا۔

خوش قسمتی سے اُن ہی دنوں بڑنگر کے راجہ کے وزیر مدن مہتہ کی لڑکی آٹھ سال کی ہو گئی تھی۔ پُرانے رواج کے مطابق اُس کے لئے لڑکا ڈھونڈھنے کے لئے پروہت بھیجے گئے ۔ پروہت جی جوناگڑھ گئے۔ اُنھوں نے بہت سے گھر دیکھے لیکن کوئی لڑکا اُنھیں جچا نہیں وہ واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے مذاقاً کنیا کے لئے نرسنگھ کا لڑکا بتا دیا۔ پروہت جی نے نرسنگھ کی بھگتی اور شرافت سے مُتاثر ہو کر ان کے لڑکے کو تلک چڑھا دیا اور شادی کا وعدہ کر لیا۔

اب پروہت جی بڑنگر لوٹ گئے اور سب حال مدن مہتہ کو سُنایا۔ یہ سُن کر لڑکی کے ماں باپ بڑے دُکھی ہوئے اور کہنے لگے ۔ ہمارے خاندانی پروہت ہو کر یہ کیا کر آئے۔

پروہت جی نے سب کو سمجھایا بجھایا اور شادی کا دن پکا کر کے نرسنگھ کو مطلع کر دیا۔ تاریخ طے ہو جانے پر نرسنگھ امداد کے لئے دوار کا پہنچے۔ وہاں جاکر پربھو کی بہت پرارتھنا کی اور بھگوان کو بیاہ میں ساتھ رہنے کی دعوت دے آئے۔ پربھو جی شامل شاہ سیٹھ بن کر بارات میں ساتھ رہے اور بارہ دن کے بعد جب بارات بڑنگر پہنچی تو اس کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مدن مہتہ کا سارا غرور ختم ہو گیا۔ اس طرح شاہی ٹھاٹ باٹ سے بھگت کے لڑکے کی شادی ہوئی۔

جس طرح میراں کو اپنے مخالفوں کے ہاتھوں طرح طرح کا رنج پہنچا۔ اسی طرح نرسنگھ کو بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

کہتے ہیں کہ اُن کے چمتکاروں کی بھنک جوناگڑھ کے راجہ کے کانوں تک پہنچی۔ کچھ منھ لگے درباریوں نے راجہ کے کان بھرے کہ نرسنگھ ڈھونگی ہے، اس نے ساری روائتیں توڑ دی ہیں۔ ہری جنوں کے سنگ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ آپ اُس کی آزمائش کریں۔ تاکہ سچ اور جھوٹ کا پتہ لگے۔ راجہ نے نرسنگھ کو پکڑ منگوایا۔ اور للکارا کہ اگر تیرے بھگوان سچے ہیں تو انھیں اب اپنی مدد کے لئے بلا۔ اگر صبح بھگوان تیرے گلے میں پھولوں کی مالا نہیں ڈال گئے تو سمجھ لینا کہ تیری جان کی خیر نہیں۔

نرسنگھ کو بھگوان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ دھیمے سُروں میں گانے اور کھڑتال بجا ہری کیرتن میں مشغول ہو گئے۔ بھگوان نے اس آزمائش کے وقت بھگت کی لاج رکھی اور غائبانہ طور سے نرسنگھ کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دی۔ کہتے ہیں یہ چمتکار دیکھ کر چاروں طرف کیرتن کی دھن گونجنے لگی۔

نرسنگھ نے میراں کی طرح اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعوں کو اپنے شعروں میں واضح طور سے لکھا ہے۔ ان کے مدھر پد گجرات میں گھر گھر گائے جاتے ہیں اور ان کی بھگود بھگتی کی کہانی لوگ بڑے چاؤ سے سنتے ہیں۔

کبیر

سنت کبیر کا جنم لگ بھگ ۱۳۶۸ء میں ہوا تھا۔ ان کی پیدائش سے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ کاشی میں نیرو نامی ایک جولاہا رہتا تھا۔ اس جولاہے کی بیوی کا نام نیما تھا۔ نیما اور نیرو کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ دونوں روز دُعا کرتے، پیروں کے پاس جاتے؛ منتیں مانتے، لیکن جیسے اولاد کا سُکھ اُن کی قسمت میں ہی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آخر ایک رات نیرو جولاہے نے عجیب خواب دیکھا۔ اُسے لگا جیسے اُس سے کوئی کہہ رہا ہے —— نیرو، تو لڑکا چاہتا ہے؟ اچھا، کل صُبح صُبح تو لہر تارا تالاب کے کنارے جا۔ وہاں تجھے تالاب میں کنول کے ایک پھول کے اُوپر لیٹا ہوا بچہ ملے گا۔ اپنا لڑکا سمجھ کر اسے پالنا پوسنا۔

صُبح جب نیرو کی آنکھ کھلی تب اس نے نیما سے خواب کی بات کہی۔ دونوں بھاگے ہوئے لہر تارا تالاب کے کنارے پہونچے۔ وہاں اُنھوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ کنول کے ایک پھول پر سچ مچ ہی ایک ننھّا سا بچہ لیٹا ہوا ہے۔ اُنھوں نے اُسے اُٹھا لیا اور گھر لے آئے۔ یہی بچہ بعد میں کبیر کے نام سے مشہور ہوا۔

ایسی بھی روایت ہے کہ ایک برہمن اپنی بیوہ بیٹی کے ساتھ کاشی میں گنگا اشنان کرنے آیا تھا۔ ایک دن گنگا کے گھاٹ پر اُنھوں نے مشہور مہاتما سوامی رامانند کو دیکھ کر اُنھیں پرنام کیا۔ سوامی رامانند نے براہمن کی لڑکی کو آشیرواد دیا۔ بیٹی، پُتروتی ہو (یعنی تیری گود بھرے)

اُن یہ آشیرواد سُن کر برہمن چونک پڑا اور بولا —— مہاراج، میری لڑکی تو بیوہ ہے۔ آپ نے اسے پتروتی ہونے کا آشیرواد کیسے دیا۔؟

سوامی رامانند بولے —— اب آشیرواد تو دے ہی چکا ہوں۔ یہ آشیرواد جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس لڑکی کا پُتر بہت بڑا سنت ہوگا۔

سچ مچ ہی کچھ دنوں کے بعد برہمن کی لڑکی کو بچّہ ہوُا۔ بیوہ ہونے کی وجہ سے اس نے بچّے کو چھُپا کر لہرتارا تالاب کے کنارے رکھ دیا اور دُکھی دل سے وہاں سے چلی گئی۔ خوش قسمتی سے اس کے کچھُ دیر بعد نیرو نامی جولاہا اپنی بیوی نیما کے ساتھ اسی طرف سے گذرا۔ دونوں نے ایک چھوٹا بچّہ تالاب کے کنارے پڑا دیکھا تو اُسے اُٹھا لیا اور اُسے خوشی خوشی گھر لے آئے۔ نیرو کے کوئی بچّہ نہیں تھا۔ اس لئے اس بچّے کو اس نے اپنے بچّے کی طرح پالا۔

خیر، کبیر کے بارے میں یہ کہانیاں مشہور ہیں۔ اتنی بات تو صاف ہے کہ کبیر داس کے ماں باپ چاہے جو رہے ہوں ان کی پرورش نیرو جولاہے کے گھر ہوئی۔ خود کبیر اپنے شعروں میں اپنے کو جولاہا ہی کہتے ہیں۔

کبیر سوامی رامانند کو اپنا گرُو مانتے تھے۔ سوامی رامانند اس وقت کاشی کے مشہور سنت تھے۔ کہتے ہیں کہ کبیر ان سے گرُو منتر لینا چاہتے تھے۔ جب کبیر بچّے تھے تب ہی سے ان کی ایشور سے لو لگ گئی۔ اُنھوں نے سوچا کہ سوامی جی مسلمان کو تو گرُو منتر دیں گے نہیں۔ اُنھیں ایک ترکیب سُوجھی۔ وہ گنگا کے گھاٹ کی ایک سیڑھی پر لیٹ گئے۔ اسی راستے سوامی جی واپس لوٹتے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی پُورا اُجالا نہیں ہوُا تھا۔ سوامی رامانند نہا کر واپس آرہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کا پاؤں اچانک کبیر پر پڑ گیا۔ وہ رام! رام! کہہ اُٹھے

بس، کبیر کو گرُو منتر مل گیا۔ وہ رام ہی رام رٹنے لگے۔

رامانند کے شاگرد بننے کی یہی کہانی ہے۔

سنت کبیر کے بیاہ کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں۔ کبیر پنتھی (کبیر کو ماننے والوں کا فرقہ) تو کہتے ہیں کہ وہ تمام عمر کنوارے رہے۔ لیکن کبیر جی کے شعروں میں بار بار 'لوئی' اور 'دھنیا' کا نام آتا ہے۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ لوئی کبیر کی بیوی کا نام تھا۔ ان کا کمال نام ایک لڑکا اور کمالی نام کی ایک لڑکی تھی۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے۔

کبیر شروع سے ہی بڑے مست مولا تھے۔ اُنھیں اپنے کھانے یا کپڑے کی فکر کب تھی؟ اُنھوں نے اپنے والد نیرو جولاہے کی طرح کپڑا بُننے کا پیشہ اختیار کیا۔ اور اسی سے اپنا پیٹ پالتے رہے کبیر بھیک مانگ کر کھانے والے سنت نہیں تھے۔ وہ کام کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ دھرم کے ڈھونگ سے انھیں بڑی چڑ تھی۔ خود غرضوں اور مطلب پرستوں کو تو دوسروں کی ہی فکر رہتی ہے مگر وہ تو ہمیشہ یہی گاتے تھے —

سائیں اتنا دیجئے جا میں کٹمب سمائے
میں بھی بھوکا نہ رہوں سادھو نہ بھوکا جائے

یا

سادھو سنگرہ نہ کرے، ادر سماتا لیئے
آگے پیچھے ہری کھڑے، جو مانگو سو دیئے

کبیر کی بھگتی تو گیان کی بھگتی تھی۔ وہ نہ مندروں میں جانا پسند کرتے تھے اور نہ مسجدوں میں۔ وہ خدا کو ہر جگہ موجود مانتے تھے۔ جہاں بھی اُنھیں بُرائی دکھائی دیتی وہ صاف صاف کہہ دیتے۔ کھری اور سچی بات کہنے میں وہ کبھی نہ ڈرتے تھے۔ مسلمانوں سے کہتے —

کنکر پتھّر جوڑ کے مسجد لئی چُنائے
تا چڑھ مُلّا بانگ دے بہرا ہُوا خدائے

ہندوؤں کو کبیر سُناتے —

پاتھر پُوجے ہری ملے تو میں پُوجوں پہار
تاتے یہہ چاکی بھلی پیس کھائے سنسار

مہاتما کبیر کو دھرم کا کٹّر پن اور اس کے جھُوٹے دکھاوے پسند نہ تھے۔ چاہے وہ کسی مذہب کے ہوں۔ وہ مُسلمان اور ہندُو دونوں مذہبوں کے ٹھیکے داروں کو کھری کھری سُناتے، دونوں کا مذاق اُڑاتے اور دونوں کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ جھُوٹ اور ناانصافی کو وہ برداشت نہ

کر سکتے تھے۔ اسی لئے جو ذاتیں پچھڑی ہوئی تھیں، جو کچلی گئی تھیں اور جو دونوں مذہبوں کی رسوم پرستی کی وجہ سے دکھی یا پسماندہ تھیں، اسی ذات کے لوگ زیادہ تر ان کے بھگت ہوئے۔ سنت کبیر انہی کی زبان میں سب کچھ کہتے تھے۔ چھوت چھات اور سماج کی مختلف برائیوں کے شکار ہری جنوں کی کبیر نے ہمت بندھائی اور اپنے کو اونچی ذات کا کہنے والے ہندوؤں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی لئے چھوٹی ذات کے پسماندہ اور کچلے ہوئے لوگ کبیر کو اپنا مددگار اور دوست سمجھتے تھے۔ اس سے پنڈت، مُلّا اور ذات پات کا فرق کرنے والے کٹر لوگ کبیر کے دشمن ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ سکندر لودی نام کے ایک سلطان کو کبیر کا مسلمانوں کی برائی کرنا بالکل پسند نہ تھا۔ اس نے ایک بار کبیر کو زنجیروں سے باندھ کر گنگا میں پھینکوا دیا۔ لیکن کبیر پر خدا کی مہربانی تھی۔ زنجیریں ٹوٹ گئیں اور وہ تیرتے ہوئے گنگا سے باہر نکل آئے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک بار کبیر غصّے سے پاگل ہاتھی کے آگے پھینکے گئے۔ جب ہاتھی کبیر کے پاس پہونچا۔ تب وہ اپنے آپ شانت ہو کر دوسری طرف کو چلا گیا۔

کبیر سب جان داروں سے رحم دلی کا برتاؤ کرتے اور سب سے پریم کرتے تھے۔ وہ تب ہی تو کہتے ہیں ——

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کو پڑھے سو پنڈت ہوئے

اُنھوں نے سارا گیان اپنی سیدھی سادی زبان میں دیا ہے۔ ان کی زبان میں برج، پوربی، راجستھانی، پنجابی، عربی اور فارسی کی ملاوٹ ہے۔ کبیر کی زبان بڑی مؤثر ہے۔ گہری سے گہری بات بھی کبیر بڑے ہی سیدھے ڈھنگ سے یوں کہہ دیتے تھے کہ اس کا دل پر سیدھا اثر ہوتا تھا۔ وہ زبان کے اصولوں کے مطابق نہیں چلتے تھے۔ لیکن وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اسے جنتا تک پہونچا ضرور دیتے تھے۔

زبان کی طرح ان کا دھرم بھی سبھی دھرموں اور خیالوں کا نچوڑ تھا۔ انھوں نے سبھی

سنتوں کی اچھی اچھی باتوں کو اپنا لیا تھا۔ ان کے پدوں اور ساکھیوں سے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ ویدوں اور اپنشدوں میں بھی ہے، بودھ دھرم میں بھی ہے اور یوگیوں کے یوگ میں بھی ہے اور اسلام کے صوفیانہ عقائد میں بھی۔ کبیر کی تعلیمات میں سچے جذبات بھی ہیں اور گیان و معرفت بھی۔ انھوں نے اپنا دھرم 'سہج' بتایا۔ اس سے غالباً ان کی مراد ایک ایسا مذہب ہے جس پر عام لوگ چل سکیں جو ہر طرح کی رسوم پرستی سے پاک ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو سماج زوال پذیر تھا۔ مذہب کے نام پر بہت سی برائیاں آگئی تھیں۔ ان برائیوں کو ختم کرکے 'سہج دھرم' کی تعلیم دینے کا حوصلہ کبیر جیسے سنت ہی میں تھا۔ نہیں تو کون اس مشکل راستے پر چلتا۔ جہاں دکھ اور مذمت اور نکتہ چینی کے علاوہ کسی اور چیز کی امید کم تھی۔ اس زمانے یہ سب باتیں کہنا کانٹوں پر چلنا تھا لیکن کبیر نڈر تھے۔ وہ جو ٹھیک سمجھتے اسے کہنے میں ذرا نہ ڈرتے تھے۔ سچا ہندو اور سچا مسلمان کون ہے۔ اس کے بارے میں کبیر کہتے ہیں ـــــ

سو ہندو سو مسلمان

جا کا درس رہے ایمان

سو برہمن جو کتھئے برہم

قاضی سو جانے رحمان

کبیر تو سچے گیانی اور بھگت تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا ایک ہی ہے۔ نام الگ الگ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چاہے رام کہو یا رحیم کہو، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ اسی کی عبادت کرنی چاہیئے۔ وہ پریم، سچائی اور خدمت کے پرچار میں لگے رہ کر بھی ہر وقت خدا کا نام جپتے رہتے تھے۔ کبھی تو اس کی بہوریا (بیوی) بن بیٹھتے اور کبھی اسے ماتا بناکر آپ بچہ بن جاتے، کہتے ـــــ 'ہری' تو جننی میں بالک تیرا۔

کبیر اپنی سادگی اور نیکی کی وجہ سے سب کے پیارے تھے۔ کہتے ہیں جب ان کی

موت ہوئی تب ہندو اور مسلمان دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ہندو کہتے تھے کہ وہ ہندو تھے، مسلمان کہتے تھے کہ وہ مسلمان تھے۔ ہم ان کی قبر بنائیں گے۔ جھگڑا طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ آخر میں جب کپڑا اُٹھا کہ ان کی لاش کو دیکھا گیا تو وہاں پھولوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ آدھے پھول مسلمانوں نے لے لئے اور قبر بنا دی۔ آدھے ہندوؤں نے لے کر سمادھی بنا دی۔ سنت کبیر کی موت مگھر میں ۱۵۱۸ء (یا ۱۵۷۵ء) میں لگ بھگ ۱۲۰ برس کی عمر میں ہوئی۔

کبیر داس کے زمانے میں بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایکتا کا مسئلہ تھا۔ اُنھوں نے بڑے حوصلے سے ہندو اور مسلمانوں میں ایکتا کی نیو ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ ایک دُوسرے کے ساتھ پریم اور ہمدردی کا برتاؤ کرنا ہی سچا دھرم ہے۔ کبیر نے ہی سب سے پہلے یہ بات ڈنکے کی چوٹ کہی کہ سب دھرموں کا پرماتما ایک ہے اور ہم سب اسی کی اولاد ہیں۔ چاہے ہم ہندو ہوں یا مسلمان، یا عیسائی، سب ہمارے بھائی ہیں۔

جو بات آج سے کئی سو برس پہلے کبیر کہہ گئے، وہی بات ہمارے باپو (مہاتما گاندھی) زندگی بھر کہتے رہے۔ گاندھی کو کبیر کا یہ بھجن بہت پسند تھا۔ "رام کہو یا رحیم کہو، مطلب تو اس کی یاد سے ہے۔"

سنت کبیر بھارت کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں، جنہوں نے دیش کو اپنے وقت میں دھرم اور سماج کا صحیح راستہ دکھایا اور لوگوں کو سچائی، پریم، اتفاق اور انسانیت کا پیغام دیا۔

نانک

سکھ دھرم کے بانی گورو نانک دیو کا جنم ۱۴۶۹ء رائی موئی تلونڈی (ننکانہ صاحب) گاؤں کے ایک کھشتری خاندان میں ہُوا تھا۔ یہ گاؤں لاہور سے ۳۵ میل دُور دکن پچھم میں ہے۔ ان کے پتا کا نام مہتہ کالو تھا اور ماتا کا نام ترپت تھا۔ مہتہ کالو گاؤں کے پٹواری تھے۔

کہتے ہیں، نانک دیو کو بچپن ہی سے خدا سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم کوئی نیا کھیل کھیلنا چاہتے ہو تو جو میں کرتا ہوں وہی کرو۔ تم میری طرح بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ ساتھ من ہی من میں 'ستیہ کرتار' کہتے چلو۔

جب نانک دیو سات برس کے ہوئے تب ان کے پتا انھیں گوپال پنڈت کے پاس پڑھنے کے لئے لے گئے۔ گوپال پنڈت نے نانک دیو کو بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور ان سے پڑھنے کے لئے کہا۔ نانک دیو نے اُستاد سے پُوچھا — گرو جی آپ مجھے کیا پڑھائیں گے؟

اُستاد بولے — میں تمھیں دوکان داری کا سارا حساب کتاب اور گنتی اور دوسری کتابیں پڑھاؤں گا۔

یہ سُنتے ہی نانک دیو نے جواب دیا — میں ایسی پڑھائی نہیں پڑھوں گا۔ یہ پڑھائی تو اس فانی دُنیا ہی میں رہ جائے گی۔ میں تو ایسی پڑھائی پڑھوں گا جو آخری وقت میں بھی میرے کام آئے۔

یہ سُن کر گورو جی حیرانی کے ساتھ گورو نانک کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

جب ان کے پتا نے دیکھا کہ ہندی اور حساب پڑھنے کا شوق بیٹے کو نہیں ہے تو وہ کچھ سوچ کر اُنھیں پہلے برج لال پنڈت کے پاس سنسکرت پڑھنے اور پھر مولوی قطب الدین

کے پاس فارسی پڑھنے کے لئے لے گئے۔ لیکن یہ دونوں اُستاد بھی کم سن نانک کی ذہانت کو
دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نانک نے سنسکرت اور فارسی پڑھنا بھی منظور نہیں کیا۔ نانک دیو
کے پتا کو یقین ہو گیا کہ انھیں پڑھانا لکھانا بےکار ہے۔ اس لئے اُنھوں نے اب نانک دیو
کو بھینسیں چرانے کے لئے بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ بھینسوں کو لے کر جنگل میں چلے جاتے اور
وہاں ایشور کا دھیان کرنے بیٹھ جاتے۔

ایک دن جب وہ دھیان میں لگے تھے تب اُن کی بھینسیں ایک جاٹ کے کھیت میں
گھس گئیں اور کھیت کا ایک حصّہ اجاڑ ڈالا۔ جاٹ نے گاؤں کے بڑے مکھیا کے پاس
شکایت کی۔ مکھیا نے نانک دیو کو بلا کر پوچھا ـــــ تم نے بھینسوں کی دیکھ بھال کیوں نہ
کی۔ جس کی وجہ سے اس آدمی کے کھیت اجڑ گئے۔

نانک نے فوراً ہی جواب دیا ـــــ اُجاڑنے والا اور رکھنے والا تو خود ایشور ہی ہے۔
اس نے اُجاڑا ہے تو وہ بنا بھی دے گا۔ ہم اور آپ اس میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

کہتے ہیں، بچے کے منھ سے یہ جواب سُن کر مکھیا کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

نانک دیو کی ایک بڑی بہن نانکی تھیں۔ ان کا بیاہ ہو چکا تھا۔ وہ نانک دیو
کو بہت پیار کرتی تھیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ پتا نانک دیو سے ناراض رہتے ہیں تب
وہ اپنے شوہر سے اصرار کر کے اُنھیں اپنے گھر سلطان پور لے آئیں۔ یہاں آکر نانک دیو
نے دولت خاں کے مودی خانے کا کام سنبھال لیا اور وہاں بیٹھ کر سامان بیچنے لگے۔

جب نانک دیو ۱۹ سال کے ہوئے تب ان کی شادی مُل چندر جی کی بیٹی سُلکشنا دیوی
سے کر دی گئی۔ سلکشنا دیوی سے سری چندر اور لکشمی داس نام کے دو بیٹے ہوئے۔

نانک دیو اب تک کسی طرح مودی خانے کا کام چلا رہے تھے۔ لیکن وہ بہت سے
لوگوں کو دام لئے بغیر ہی سودا تول دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی کے پاس پیسے نہ ہوں تو
کیا اُسے ضرورت کا سامان نہیں دیا جائے؟ غریبوں کو نانک دیو کی مہربانی سے مفت ہی سامان

ملنے لگا۔

ایک بار ان کے ساتھ ایک عجیب واقعہ درپیش آیا۔ وہ ایک شخص کو آٹا تول رہے تھے۔ ایک سیر دو سیر تین سیر...... اسی طرح بارہ سیر تک کی گنتی ٹھیک آئی لیکن تیرہ آتے ہی آپ نے 'تیرا' کہنا شروع کردیا۔ بھلا اس دنیا میں میرا کیا ہے۔ سبھی کچھ تیرا (ایشور کا) ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے سارا آٹا دے ڈالا۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ اسی دن انھیں مودی خانے سے الگ کردیا گیا۔

نانک نے زندگی بھر لوگوں کے درمیان بھید بھاؤ مٹانے اور ان کے اختلافات دور کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ سبھی اس پرم پتا پرمیشور (قادر مطلق) کے بندے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں کوئی برا نہیں ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی چھوڑ کر پہلے ہمیں اپنے عیوب دیکھنے چاہئیں۔ اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تبھی ہماری زندگی خوش گوار ہو سکتی ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنا ہی گرو نانک کا پیغام ہے۔

نانک بھی اپنے وقت کے بہت بڑے سماج سدھارک تھے۔ انھوں نے چھوت چھات اندھی عقیدت اور مذہب کے ظاہری رسم ورواج اور بندشوں کی سخت مخالفت کی۔ لوگوں کی سیوا، انسانی دوستی اور مل جل کر رہنے کی اہمیت سمجھائی۔ انھوں نے لوگوں کو میل ملاپ سے رہنے کا درس دیا۔ ہندو مسلم ایکتا کے وہ بہت بڑے حمایتی تھے۔ انھوں نے کہا کہ سبھوں کا ایشور ایک ہی ہے۔ جگہ جگہ گھوم گھوم کر انھوں نے لوگوں کو انسان دوستی کا سبق پڑھایا اور شانتی کا پرچار کیا۔ سکھ اور شانتی کے اپدیش لوگوں تک پہونچانے کے لئے ہی گرو نانک نے دیش ودیش کا سفر کیا۔

سب سے پہلے وہ ایمن آباد جاکر لالو نامی ایک بڑھئی کے گھر ٹھہرے اور وہاں سے دلّی گیا، کاشی، ہردوار اور جگن ناتھ پوری تک گئے۔ اس کے بعد وہ دکن بھارت کی طرف

گئے اور وہاں سیتو بندھ رامیشورم، آبرد گیر اور لنکا وغیرہ جاکر اُنھوں نے اپنی باتوں کا پرچار کیا۔ دکن سے لوٹنے کے بعد انھوں نے گڑھوال، ہیم کوٹ، ٹہری، سرمور، گورکھ پور، سکم، بھوٹان اور تبت وغیرہ کی یاترا کی اور اپنا پیغام لوگوں کو سُنایا۔ چوتھی اور آخری یاترا میں وہ بلوچستان ہوتے ہوئے مکہ تک گئے۔ اس سفر میں انھوں نے ایران، قندھار، کابل اور بغداد وغیرہ میں 'ستیہ نام' کے اُپدیش دیئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ سنسار کے سارے کام اس ایک پرم پتا (ایشور) کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اس لئے لڑائی جھگڑے اور چھوٹے بڑے کا فرق مٹا کر سچے دل سے اس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ جو شخص رحم دلی، ایمان داری، انکساری، پیار و محبت اور سچائی کو اپناتا ہے۔ وہی اس زندگی میں سُکھ پاتا ہے۔

نانک دیو کی باتوں کا سبھی مذہب کے لوگوں پر ایسا گہرا اثر پڑتا تھا کہ بہت سے لوگ فوراً ہی ان کے شاگرد بن جاتے تھے۔

گورو نانک اپنی باتوں کو بڑے نرالے ڈھنگ سے پیش کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ عرب میں تھے تو ایک دن کعبہ کی طرف پیر کرکے سو گئے۔ اس سے وہاں کے لوگ بگڑ اٹھے اور بولے — "خُدا کے گھر کی طرف پیر کرکے مت سو!"

گورو نانک نے جواب دیا — "تو جدھر خُدا کا گھر نہ ہو ادھر ہی میرے پاؤں کر دو۔"

سب لوگ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ گورو نانک کے پاؤں کس طرف کریں، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ خُدا تو ہر جگہ موجود ہے۔

گورو نانک کا اُپدیش دینے کا یہی ڈھنگ تھا۔ انھوں نے کتنی سیدھی سادی زبان میں اور کتنے آسان ڈھنگ سے ان لوگوں کو اپنی بات سمجھا دی۔ اسی لئے ان کے اُپدیشوں کا لوگوں پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ اور لوگ عقیدت سے ان کے سامنے اپنا سر جُھکا دیتے تھے۔

نانک دیو کی عظمت کا ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ ایک بار نانک دیو کے پتا نے ان سے کہا کہ وہ گجرانوالہ ضلع کے چوہڑکانہ نامی گاؤں سے نمک ہلدی وغیرہ خرید لائیں۔ راستے میں

نانک دیو کو کچھ ننگے فقیر ملے۔ اُنھوں نے ساری رقم ان پر خرچ کر ڈالی۔ پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ میں نے تو سچا سودا کیا ہے۔

گرُو نانک نے ہندو، مسلمان، جین، وغیرہ سبھی دھرموں کے مُقدّس مقامات کی یاترا کی تھی۔ سبھی جگہ اُنھوں نے "ستیہ کرتار" یعنی خدا کی عبادت کرنے کی نصیحت کی۔ اور سبھی دھرموں کے ماننے والوں کو اپنی باتوں سے مُتاثر کیا۔ اسی لئے ہندو ہوں یا مسلمان، جین ہوں یا بُدھ سبھی ان کی عزت کرتے تھے اور بہت سے لوگ تو ان کے چیلے بھی بن گئے تھے۔

نانک دیو کے دو خاص چیلے تھے ــــ بالا اور مردانہ تو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔

ایک بار نانک دیو پنجاب میں گھومتے ہوئے حسن ابدال نامی جگہ پر پہونچے۔ وہاں باوا ولی قندھاری نام کے ایک فقیر رہتے تھے۔ اتّفاق سے اس علاقے میں پانی کا ایک ہی سوتا تھا جو ان کے قبضے میں تھا۔ اس فقیر نے مردانہ کے بار بار منت کرنے پر بھی نانک دیو کو پانی دینے سے انکار کر دیا، تب نانک دیو نے زمین کو چیر کر اپنے لئے پانی کا سوتا نکالا۔ اس وجہ سے فقیر کا سوتا سوکھ گیا۔ اُنھوں نے غصّے میں آکر اوُپر سے پہاڑ کا ایک ٹکڑا لڑھکا دیا جسے نانک دیو نے اپنے پنجے سے روک لیا۔ پتھّر پر ان کے پنجے نشان بن گیا۔ اب اس مقام پر ایک شاندار گوردوارہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ گوردوارہ پنجہ صاحب کے نام سے مشہوُر ہے۔

۲۵ سال تک ادھر اُدھر کی سیاحت کرنے کے بعد گرُو نانک کرتار پور میں آکر بس گئے اور وہیں اُپدیش دینے لگے۔

وہیں ۱۵۳۸ء میں آسن مہینے کے دسویں تاریخ کو گرُو نانک دیو کی رُوح اس جسمِ فانی کو چھوڑ کر جنت شدھار گئی۔ موت کے وقت ان کے بہت سے چیلے ان کے پاس اکٹھے ہو گئے تھے۔ اب ہندو اور مسلمان چیلوں میں نانک دیو کے لئے جھگڑا ہونے لگا۔

ہندو کہنے لگے کہ وہ ہمارے گورو تھے۔ اس لئے سنسکار کریا ہم کریں گے۔ دُوسری طرف مسلمان کہتے تھے کہ وہ ہمارے پیر تھے ہم اُنھیں دفنائیں گے۔

جس ذات پات کے فرق کو مٹانے کے لئے گورو نانک زندگی بھر کوشش کرتے رہے۔ اُسی کو لے کر ان کے چیلوں میں ایسی تکرار ہُوئی ہو یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ لیکن کہتے ہیں کہ جب ان کے چیلوں نے ان کی چادر اُٹھا کر دیکھا تو وہاں ان کا جسم تھا ہی نہیں صرف کچھ پھُول پڑے تھے۔ دونوں نے آدھے آدھے پھُول لے لئے۔ اور اپنے اپنے ڈھنگ سے ان کا سنسکار کیا۔ یہی کہانی کبیر کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔

گورو نانک چلے گئے، لیکن ان کے اُپدیش آج بھی ہمیں روشنی دکھاتے ہیں۔ وہ سچے معنوں میں تیاگی اور مہاتما تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے اور کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ اس لئے وہ زور دے کر کہتے تھے کہ انسان کے رُوپ میں پیدا ہو کر جو شخص بھلائی اور نیکی نہیں کرتا اس کا جسم اکارت ہے۔ گورو نانک دیو کے بارے میں یہ دوہا مشہور ہے۔

گورو نانک شاہ فقیر
ہندو کا گرُو مُسلمان کا پیر

سُورداس

ہندی کے بھگت کویوں میں مہاتما سُورداس کا مقام تُلسی داس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہندی ادب کو سورداس نے بہت کچھ دیا ہے۔ یہاں ہم مختصر طور پر ان کے بارے میں بتائیں گے۔

یہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ سُورداس کا جنم کس سن میں ہُوا تھا اور کب ان کی موت ہُوئی۔ لیکن اس بات میں شک نہیں کہ وہ بادشاہ اکبر کے عہد میں ہُوئے تھے۔ "آئینِ اکبری" میں ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن جیسے آج کل ہر ایک اندھا، جو تھوڑا بہُت گا لیتا ہو، سُورداس کہلانے لگتا ہے۔ ویسے ہی اس وقت بھی بہت سے اندھے اور کئی ایک آنکھوں والے بھی اپنے بھجن کیرتن کی وجہ سے سُورداس کہلانے لگے تھے۔ ان میں تین سُورداس بہُت مشہُور ہوئے۔

ان سُورداسوں میں ایک بلوا منگل تھے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی دونوں آنکھوں میں سُوئی چبھولی تھی اور اس طرح سُورداس بنے تھے۔ دُوسرے سُورداس کا اصلی نام مدن موہن تھا۔ وہ اکبر کے دربار میں گایا اور ناچا کرتے تھے اور اندھے ہونے کی وجہ سے سُور کہلانے لگے تھے۔ تیسرے سُورداس وہ تھے جنھوں نے پیدائشی اندھے ہوتے ہوئے بھی "سُورساگر" لکھی تھی اور جن کی وجہ سے ہی سورداس کا نام ہندی ادب میں امر ہو گیا ہے۔

اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ سُورداس کی پیدائش اور ان کی موت کے بارے میں یقینی طور سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن اب تک جو ثبوت ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سُورداس کا

جنم ۱۴۸۳ء (یا ۱۵۴۰ء) میں ہوا اور جن کی موت ۱۵۸۵ء (یا ۱۶۴۲ء) میں ہوئی۔ اس طرح سورداس نے لگ بھگ ۱۰۲ برس کی عمر پائی۔

'سورساگر' کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک کا نام 'سورساراولی' اور دوسرے کا نام 'ساہتیہ ہری' ہے۔

"ساہتیہ ہری" میں سورداس نے اپنے خاندان کا مختصر حال لکھا ہے۔ اپنے خاندان کا ذکر انھوں نے اس وقت کے رواج کے مطابق کیا ہے۔ سورداس نے لکھا ہے کہ راجہ پرتھو نے ایک بار یگیہ کیا۔ اس یگیہ سے ایک عظیم انسان پیدا ہوا۔ برہما نے اس عظیم شخص کا نام برہم راؤ رکھا۔ اسی برہم راؤ کے خاندان میں چندربھٹ (چندروردائی) کا جنم ہوا۔ دلی کے سمراٹ پرتھوی راج کے دربار میں چندربھٹ کو بڑی عزت حاصل تھی۔ اسی نے 'پرتھوی راج راسو' لکھی ہے۔ اسی چندربھٹ کے خاندان میں آگے چل کر ہرچندر پیدا ہوئے۔ یہی ہرچندر مہاتما کے اتالیق تھے۔ سورداس جن کا اصلی نام سورج چندر تھا' سات بھائی تھے اور ساتوں میں وہ سب سے چھوٹے اور جنم سے اندھے تھے۔ ان کے بھائی جنگ میں مارے گئے۔ چھ بھائیوں کی موت ہو جانے پر سورج چندر دُکھی ہو کر اکیلے ہی گھر سے نکل پڑے۔ اندھے ہونے کی بنا پر وہ راستے میں ایک کنوئیں میں گر پڑے اور سات دن تک اسی میں پڑے رہے۔ کہتے ہیں کہ ساتوں دن خود بھگوان کرشن نے ان کو کنوئیں سے نکالا اور ان کی باطنی کی آنکھیں کھول دیں۔ اسی وقت سے سورداس برج میں رہنے لگے اور بھگوان کرشن کی بھگتی میں محو ہو گئے۔

اُوپر کی کہانی سورداس ہی کی زبانی ہے۔ اس کہانی کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ سورداس کے آباؤ اجداد عبادت و ریاضت کا پرچار کرنے والے برہمن تھے۔ اسی برہمن خاندان میں پرتھوی راج کے عہد میں چندربھٹ اور آگے چل کر بادشاہ اکبر کے عہد میں سورج چندر پیدا ہوئے۔ سورج چندر جنم کے اندھے تو تھے ہی وہ اگیان کے کنوئیں میں

گر پڑے۔ بھگوان کرشن نے ان پر مہربانی کی اور اُنھیں باطن کی روشنی دے کر اگیان کے گڑھے سے نکالا۔ اسی طرح من کی روشنی پاکر اُنھوں نے ایک لاکھ پدوں (شعروں) کی رچنا کی۔ ایک لاکھ اشعار لکھنے کی بات اُنھوں نے سور سارا ولی میں خود ہی لکھی ہے ——

تو دن میں ہری لیلا گاہے ایک لکش پد بند

لیکن سورداس کے لکھے ہُوئے سات ہزار اشعار ہی مل سکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ 'ایک لکش پد بند' کا یہ مطلب ہو کہ انھوں نے ایک لکشیہ یعنی ایک ہی لگن سے ان پدوں کو لکھا ہو۔ لیکن سات ہزار اشعار بھی کم نہیں ہوتے اور ان کے مجموعے کا نام 'سور ساگر' بالکل موزوں ہے۔

اُوپر کہا جا چکا ہے کہ سورداس بادشاہ اکبر کے عہد میں ہُوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار اکبر نے تان سین سے سُورداس کا ایک پدسُن کر اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت سورداس متھرا میں تھے۔ کچھ عالموں کا خیال ہے کہ اکبر نے وہیں جاکر سُورداس سے مُلاقات کی تھی۔ کچھ دُوسروں کے مطابق سورداس اور اکبر کی مُلاقات دِلّی میں ہُوئی تھی۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں کی ملاقات پریاگ میں اس وقت ہُوئی تھی جب اکبر وہاں قلعہ اور بند بنوانے گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بلو امنگل سورداس اور مدن موہن سورداس سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ جب 'سور ساگر' کے خالق سورداس کے اشعار اس کے کانوں تک پہونچے، تب اپنے وقت کے نورتنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے دربار میں رکھنے والے اس مہان راجہ نے سچے سُورداس کی کھوج کی اور اُس سے ملا۔ لیکن وہ اُنھیں دِلّی بلاکر اپنے دربار میں رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہُوا۔ سُورداس نے تو اپنا جیون کرشن بھگوان کی سیوا کے لئے وقف کر دیا تھا۔

اُن ہی دنوں ایک اور مہاپرش تھے جو سورداس کو اکبر سے بھی زیادہ مہان معلوم

ہوُئے۔ سُورداس نے ان کی سیوا میں رہنا بہت پسند کیا۔ وہ مہا پُرش تھے اچاریہ ولبھ اچاریہ
وہ ویشنو دھرم کے مہان پرچارک تھے۔ جب وہ دکن میں اپنے علم و فضل کی دھاک بٹھا کے
شمالی ہندوستان آئے تب سُورداس کی شہرت سُن کر وہ خود ہی ان سے ملنے چلے۔ اس وقت
سُورداس جی گوگھاٹ میں سنیاسی بن کر رہتے تھے۔ یہ مقام آگرہ اور متھرا کے بیچ میں تھا
اچاریہ ولبھ نے اپنی نفس کشی کے لئے گوردھن میں ایک چھوٹا سا مندر بنوایا تھا۔ یہ
مندر شری ناتھ مندر کے نام سے مشہُور ہوُا۔ اس مندر میں پوجا اور گیان دھیان کا سب
انتظام تھا۔ صرف کیرتن کا انتظام باقی تھا۔ اسی سلسلے میں سورداس جی کا تعاون حاصل کرنے
کے لئے ولبھ اچاریہ گوگھاٹ پہونچے۔

سُورداس جی کو جب خبر ملی کہ دکھن ہندوستان میں اپنے علم و فضل کی دھاک جمانے
والے گوگھاٹ آئے ہیں تو وہ خود ہی جا کر ان سے ملے۔ اچاریہ نے سُورداس کو اپنے نزدیک
پیار سے بٹھایا اور کیرتن کے پد گانے کے لئے کہا۔ سُورداس جی نے 'ہوں ہری سب پتتن
کو نائک' گایا۔

تب اچاریہ نے کہا — سُور ہو کر اس طرح گھگھیاتے کیوں ہو؟ بھگوان کی کچھ
لیلاؤں کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟

سُورداس جی نے کہا — مہاراج! میں کچھ جانتا نہیں ہوں۔

کہتے ہیں، اچاریہ نے انھیں تعلیم دی۔ اُنھیں بھگوت کے کچھ حصے سُنائے اور
'پرشوتم سہسر نام' بھی سُنایا۔ اب تو سُورداس جی کے دل پر پوری بھگوت نقش ہوگئی۔ انھوں نے
ولبھ اچاریہ سے خود تعلیم لی اور اپنے تمام شاگردوں کو بھی دلوائی اور سب کو لے کر ان کے
ساتھ ورج (برج) چلے گئے۔ گوردھن پہونچنے پر اچاریہ نے سُورداس کو شری ناتھ جی کا درشن
کرایا۔ اس وقت سُورداس جی نے یہ پد گایا:

اب میں ناچیو بہت گوپال

یہ سُن کر اچاریہ بہت خوش ہوئے اور بولے —— سُورداس، اب تم میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔

اب تک سُورداس عاجزی اور انکساری سے بھرے ہوئے شعر لکھتے تھے۔ وہ اپنے کو ایشور کا داس مان کر بھگتی سے بھرپور پد بناتے اور گاتے تھے۔ اب وہ بھگوان کرشن کے جنم اور ان کی لیلاؤں کا حال بیان کرنے لگے۔

سُور کے سارے پدوں کو دو حصّوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے حصّے میں ونے (التجا) کے پد آتے ہیں، جو اُنھوں نے اچاریہ ولبھ سے ملنے سے پہلے لکھے تھے۔ دوسرے میں ہری لیلا کے پد ہیں، جو اُنھوں نے اچاریہ سے ملنے کے بعد لکھے۔ 'سور ساگر' میں جو ہزاروں پد ہیں، وہ ہری لیلا والے پد ہیں، جنھیں آج بھی بھجنوں کے رُوپ میں لوگ بڑے ذوق وشوق سے گاتے ہیں۔

سُورداس نے بھگوان کی تعریف وتوصیف صرف آقا اور دوست کی حیثیت سے نہیں کی ہے بلکہ بھگوان کو پِتا اور اپنے کو پُتر مان کر بھی اس کے گُن گائے ہیں۔ ان کے اشعار تصوف سے بھرے ہوئے ہیں۔ بھگوان کرشن کی بال لیلاؤں (بچپن کی شرارتوں) کا ذکر سُورداس نے جس دل چسپ انداز سے کیا ہے۔ اُسے پڑھ کر یا سُن کر چھوٹے چھوٹے شرارتی اور پیارے بچّوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہم ایک معمولی لڑکے میں ہی بھگوان کے درشن کرنے لگتے ہیں۔

سُورداس نے اپنی ساری زندگی شری کرشن بھگوان کے گُن گانے میں گذار دی۔ وہ صبح سے شام تک کرشن کی پُوجا میں تن من سے لگے رہتے تھے۔ ویشنوؤں کے پوجا کا یہ 'پُشٹ مارگ' کہلاتا ہے۔ مہاتما سُورداس نے ویشنوؤں کی سیوا بھاونا کو گیتوں میں ظاہر کیا ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں یشودھا بن کر بالک کرشن کو جگاتے ہیں۔ ہاتھ منھ دُھلاتے ہیں، نہلاتے ہیں، کھلاتے ہیں، جیسے ——

جاگئے گوپال لال بھور بھئی پیارے

ابھی یسودا ماکھن لائی
جیوت کانہہ نند کی کنیا

سُور کا مطلب سُورج ہوتا ہے۔ 'سُور ساگر' کے پدوں میں انھوں نے اپنا نام 'سُورا'، 'سُورج' یا 'سُورج داس' لکھا ہے۔ سُور چھوٹا سا لفظ ہے۔ اس لئے یہ مقبول ہوا اور سب کی زبانوں پر چڑھ گیا۔ ان کے پیدائشی اندھے ہونے کی وجہ سے یہ لفظ اندھے پن کا مترادف بن گیا۔ یہاں تک کہ آج کل کسی اندھے کو 'سُورداس' کہہ دو۔ تو وہ خوش ہوگا۔ اس طرح سورداس کے پد جہاں آنکھوں والوں کو مسّرت بخشتے ہیں۔ وہاں ان کی زندگی اندھوں کو بھی راستہ دکھاتی ہے کہ وہ آنکھیں نہ ہونے پر اپنی 'لگن' اور پُرخلوص کوششوں سے اپنی زندگی کو کارآمد بنا سکتے ہیں۔

شیر شاہ سُوری

شیر شاہ کا اصلی نام فرید خان تھا اور وہ ایک جاگیر دار حسن خان کا بیٹا تھا۔ 'شیر خان' کا نام اُسے اپنی بہادری کی وجہ سے ملا تھا۔

شیر شاہ کے دادا سُور ذات کا افغان تھے۔ وہ پشاور کے نزدیک رہتے تھے۔ ان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اس لئے وہ فوجی نوکری کی تلاش میں پنجاب آئے اور ہوشیار پور شہر کے پاس بجواڑہ پرگنہ میں رہنے لگے۔ وہیں ۱۴۷۲ء میں فرید کی پیدائش ہوئی۔ فرید ابھی بچہ ہی تھا کہ حسن کو جونپور کے صوبیدار کے یہاں نوکری مل گئی۔ اس نے حسن کو سہسرام کی جاگیر بخشی۔ حسن اپنے خاندان کے ساتھ سہسرام چلا گیا۔

فرید کی ماں سوتیلی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ باپ کی موت کے بعد سہسرام کی جاگیر اس کے بیٹے کو ملے۔ اس لئے فرید اس کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ بیوی کا حسن پر بھی بہت اثر تھا۔ اس لئے وہ بھی فرید کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنے لگا۔ اس کی وجہ سے فرید بڑا اُداس اور غمگین رہتا تھا۔ آخر میں وہ سہسرام چھوڑ کر جونپور چلا گیا۔ یہیں سے اس کی زندگی نے ایک کروٹ لی اور وہ مشکلوں اور تکلیفوں کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے لگا۔

سب سے پہلے اس نے اپنی تعلیم پوری کرنے کا تہیّہ کیا۔ فرید کی ذہانت سے اس کے اُستاد جمال بہت خوش ہوئے اور اُنھوں نے حسن سے کہا —— تمہارا بیٹا بہت ہی قابل ہے۔ تم اس کی قابلیت سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟

—— قابل ہے؟

— ہاں، بہت قابل ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو آگے چل کر نام پیدا کرے گا۔

کون باپ بیٹے کی تعریف سُن کر خوش نہیں ہوتا۔ حسن ویسے بھی جمال خان کی بات مانتا تھا۔ اُس نے فرید کو بُلایا اُسے سہسرام کی جاگیر کے انتظام کا کام سونپ دیا۔ فرید نے جاگیر کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ لیکن فرید کی سوتیلی ماں اُس کی کامیابی سے جل اُٹھی۔ بے چارے فرید کو پھر سہسرام چھوڑ کر آگرے جانا پڑا لیکن جب اُس کے باپ کی موت ہوئی تب فرید نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۲۲ء میں اس نے بہار کے نواب بہار خان لوہانی کے پاس نوکری کر لی اور جلد ہی اپنی محنت اور ایمانداری سے نواب کو خوش کر لیا۔ ایک دن بہار خان شکار کھیلنے نکلا، اس وقت فرید اس کے ساتھ تھا۔ جب وہ جنگل میں پہونچے تب ایک شیر نے اچانک حملہ کر دیا۔ شیر نواب کو مار ہی ڈالنے والا تھا کہ فرید بڑی بہادری سے آگے بڑھا اور اُس نے اکیلے ہی شیر کو مار ڈالا۔ بہار خان نے خوش ہو کر اسے شیر خان کا خطاب دیا۔ اور اس دن کے بعد سے وہ فرید کے بدلے شیر خان کہلانے لگا۔ اس کے علاوہ بہار خان نے اُسے اپنا وکیل اور اپنے لڑکے جلال خان کا اُستاد بھی مقرر کیا۔

فرید کے مختلف دشمنوں نے نواب کے کان بھرے جس کی وجہ سے سہسرام کی جاگیر اس سے چھین لی گئی۔ اس وقت بابر دِلّی کا بادشاہ تھا۔ زمانے کو دیکھتے ہوئے شیر خان نے مُغل فوج میں نوکری کر لی۔ اس طرح اس نے جو تجربہ حاصل کیا وہ آگے اس کے بہت کام آیا۔

سال سوا سال بعد بہار خان کی موت ہو گئی۔ شیر خان پھر بہار لوٹ آیا اور اپنے شاگرد جلال خان کا اتالیق بن کر اس کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ چار سال کے اندر اُس نے فوج کا بڑا حصّہ اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس دوران میں چنار کا حکمران

تاج خان اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی بیوہ لاڈ ملکہ نے شیر خان سے بیاہ کرلیا اور چنار کا قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔

شیر خان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خود جمال خان گھبرایا۔ اس نے اس کو الگ کردینے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

جمال خان گھبرا کر بنگال آیا اور وہاں کے راجہ محمد شاہ سے مدد مانگی۔ محمد شاہ بھی شیر خان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ڈر رہا تھا۔ وہ جمال خان کی مدد کو فوراً تیار ہوگیا۔ دونوں کی فوجوں نے شیر خان پر حملہ کیا۔ سورج گڑھ کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ جس میں بنگال کے سلطان اور افغانی سرداروں کی زبردست ہار ہوئی۔ اس کامیابی کی شیر خان کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ اگر یہ کامیابی ملی نہ ہوتی تو وہ ایک عظیم بادشاہ کبھی نہ بن پاتا۔

جب ہمایوں نے گجرات پر چڑھائی کی اور وہاں کے سلطان بہادر شاہ سے لڑنے میں مصروف تھا تو اس وقت موقع دیکھ کر شیر خان نے چپکے سے بنگال پر چڑھائی کر دی۔ سلطان محمد شاہ میں افغانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ شیر خان کی طاقت پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اس نے تین لاکھ اشرفی اور بہت سا علاقہ دے کر سمجھوتہ کر لیا۔ اس سے شیر خان کی طاقت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ادھر گجرات میں ہمایوں نے بہادر شاہ کو ہرا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے افغان سردار اپنے نئے رہنما شیر خان سے آملے۔

ہمایوں گجرات سے لوٹ کر آگرے میں رنگ رلیاں منانے لگا۔ لیکن شیر خان نے اپنے نئے افغان سرداروں کے ساتھ پھر بنگال پر چڑھائی کر دی۔ اس بار شیر خان کا ارادہ یہ تھا کہ بنگال پر قبضہ کرکے اُسے اپنی سلطنت میں ملالے۔ اس نے بنگال کے دارالخلافہ گوڑ کو جا گھیرا۔ ہمایوں کو اس حملے کی خبر ملی تو وہ چونک اُٹھا۔ شیر خان نے اس وقت کی صورت حال سے فائدہ اُٹھایا اور اپریل ۱۵۳۸ء میں گوڑ پر قبضہ کر لیا۔

ہمایوں نے آگرے سے بنگال کی طرح کوچ کیا۔ راستہ میں اس نے چنار فتح کیا اور جولائی ۱۵۳۸ء میں گوڑ کی طرف چل پڑا۔ شیر خان کو جنگ کا کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ وہ ہمایوں سے بنگال میں لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیئے وہ آپ ہی گوڑ سے ہٹ گیا اور بہار، جونپور اور قنوج میں مغل علاقوں کو جیتنا اور لوٹنا شروع کردیا۔

اس دوران برسات شروع ہو چکی تھی۔ ہمایوں طبیعتاً آرام طلب اور کاہل تھا۔ وہ گوڑ میں فتح کا جشن منانے لگا اور اپنی نیند سے اس وقت جاگا جب شیر خان نے اس کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور آگرہ لوٹنے کے سب راستے بند کردئے تھے۔ ہمایوں آگرہ واپس آنے کے لئے بنگال سے جلدی جلدی بھاگا۔ لیکن شیر خان نے اس کا راستہ آروکا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ بہت سے مغل سپاہی یا تو پکڑے گئے یا ندی میں ڈوب گئے۔ ہمایوں نے بھی اپنا گھوڑا گنگا میں ڈال دیا۔ وہ ڈوبنے ہی والا تھا کہ ایک بہشتی نے اسے اپنی مشک کا سہارا دے کر ندی پار کرا دیا۔

بعد میں جب ہمایوں بادشاہ ہوا تو کہتے ہیں کہ اس نے اپنے قول کے مطابق نظام سقہ نام کے اس بہشتی کو ایک دن تک حکومت کرنے کا موقعہ دیا۔ نظام سقہ نے اسی دن اپنے نام سے چمڑے کا سکہ چلایا۔

اب شیر خان قنوج سے آسام اور چٹ گاؤں تک کے ایک بہت بڑے علاقے کا حکمران تھا۔ اس نے اس فتح کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا۔ اور شیر خان سے شیر شاہ بن گیا۔ اس نے جیتے ہوئے علاقوں کا بڑا اچھا انتظام کیا۔ اور اپنے حسنِ انتظام سے سلطنت کی بنیادیں مضبوط بنائیں

ہمایوں بڑی کوششوں کے باوجود اپنے بھائیوں کی مدد حاصل نہ کرسکا۔ اس لئے اگلے سال اس نے اکیلے ہی شیر شاہ پر چڑھائی کی۔ ۱۷ رمئی ۱۵۴۰ء کو مغل اور افغان فوجوں کا قنوج کے پاس سامنا ہوا۔ شیر شاہ کے پاس ۵۰ ہزار سپاہی تھے اور ہمایوں

کے پاس ایک لاکھ۔ لیکن مُغل فوج کی تنظیم اور انتظام اچھا نہیں تھا۔ اس کے افسر کاہل اور عیاش تھے اور سپاہیوں کی ہمت پہلے ہی سے پست تھی۔ بغیر ایک گولا چلائے میدان افغانوں کے ہاتھ رہا۔ ہمایوں جان بچا کر بھاگا اور پندرہ سال تک اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ شیر شاہ بڑی شان سے دلّی میں داخل ہُوا اور ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

شیر شاہ پانچ برس تک دلّی کا بادشاہ رہا۔ اس کی خوبی یا بڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ ایک عام جاگیردار سے دلّی کا بادشاہ بن گیا۔ تاریخ میں اور بھی دُوسرے ایسے شخص ہُوئے ہیں جو معمولی گھرانوں میں پیدا ہو کر ترقّی کر گئے۔ شیر شاہ کی خُوبی یہ ہے کہ اس نے اس تھوڑے سے وقت میں اتنا کام کیا کہ ہم اس کے بارے میں پڑھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ ہندوستانی ہونے کے ناطے بھارتی رسم و رواج سے واقف تھا اور جانتا تھا وقت کے مطابق کون سے اقدامات کرنے چاہئیں۔ اُسے اپنے پٹھان سرداروں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی اعتماد اور مدد حاصل تھی۔ ان کی مدد سے اس نے انتظامِ سلطنت میں بنیادی تبدیلیاں لائیں اور اصلاح کئے۔ آگے چل کر اکبرِ اعظم نے انھیں اصلاحوں کی بنیاد پر اپنے انتظامی ڈھانچے کی عمارت تعمیر کی۔

شیر شاہ نے دیش کے ایک حِصّے کو دُوسرے حصّے سے ملانے کے لئے سڑکوں کا جال سا بچھا دیا۔ دراصل سڑکوں کے ذریعے ہی دیش کی یک جہتی قائم ہُوئی۔ ان سڑکوں میں سب سے بڑی گرانڈ ٹرنک روڈ ہے جو اب بھی موجود ہے۔ یہ سڑک شیر شاہ نے ہی بنوائی تھی اور یہ کلکتہ سے پشاور تک جاتی تھی۔ اس نے سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار پیڑ لگوائے۔ مسافروں کے لئے سرائے اور ڈاک کی چوکیاں بنوائیں۔ ان چوکیوں کے ذریعے ڈاک ملک کے ایک حصّے سے دُوسرے حصّے میں پہونچتی تھی۔ بادشاہ کے جاسُوس بھی مُلک بھر کی خبر اُسے بھیجتے تھے۔

شیر شاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی سلطنت کو سینتالیس حصّوں میں بانٹا۔ اپنے

افسروں کی نگرانی شیر شاہ خود کرتا تھا۔ اشوک اعظم اور ہرش وردھن کی طرح اس کا اصول تھا۔ کہ بادشاہوں کو عوام کی خدمت۔ اور افسروں کی مناسب نگرانی کے لئے ہمیشہ مستعد رہنا چاہیئے۔

یہ انتہائی قابل اور عظیم حکمراں بڑی چھوٹی عمر میں ہی مرگیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ ایک قلعے کا گھیرا ڈالے پڑا تھا کہ اچانک ایک سرنگ پھٹ جانے سے ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو شیر شاہ کی وفات ہوگئی۔

چیتنیہ مہاپربھو

چیتنیہ مہاپربھو کا جنم ۱۴۸۵ء میں ہولی کے دن بنگال کے نودیپ نگر میں ہوا تھا۔ ان کے پتا کا نام پنڈت جگن ناتھ مشر اور ماتا کا نام شچی دیوی تھا۔

نام کرن (نام رکھنے کی تقریب) کے وقت ان کا نام وشومبھر رکھا گیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور گورے تھے۔ لوگوں نے ان کا نام گورانگ رکھ دیا۔ مگر ان کی ماں پیار سے انھیں نمائی کہہ کر پکارتی تھی۔ یہ نمائی نام ہی زیادہ مشہور ہوا۔ یہی نمائی بعد میں ہر جگہ چیتنیہ مہاپربھو کے نام سے پوجے جانے لگے۔ ان کے ایک بڑے بھائی تھے۔ جن کا نام وشوسروپ تھا۔

نام کرن کے موقع پر نمائی کی طبیعت کا اندازہ لگایا گیا۔ ان کے سامنے کپڑے، ہتھیار، روپے، کتابیں وغیرہ رکھ دی گئیں۔ ننھے نمائی نے سرک سرک کر ہاتھ آگے بڑھایا اور شری مدبھگوت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس طرح گویا انھوں نے بچپن میں ہی اپنے بھگوت پریم کا مظاہرہ کر دیا۔

نمائی بچپن سے بہت شرارتی تھے۔ ان کی بچپن کی شرارتوں کو دیکھ کر شری کرشن کی بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ان کے گھر میں ایک کالا ناگ نکلا۔ نمائی کو دیکھ کر ناگ کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔ نمائی بچے تھے ہی وہ ناگ کے پھن کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے سہلانے لگے۔ ناگ جھوم رہا تھا۔ اور نمائی ہنس رہے تھے۔ کلکاریاں مار رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر ان کی ماں اور بڑے بھائی جو اسی وقت وہاں آئے تھے، ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ نمائی

نے جب ماتا کو دیکھا تو ناگ کو چھوڑ کر ماتا سے جا لپٹے۔ ناگ نے بھی اپنی راہ لی۔

ایک دن ایک برہمن نمائی کے یہاں آیا۔ ان کے پتا نے برہمن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ان کی ماں نے اسے پکانے کے لئے اناج دیا۔ برہمن نے چوکا لیپ پوت کر کھانا تیار کیا۔ کھانے سے پہلے اس نے آنکھ بند کر کے وشنو بھگوان کا دھیان کر کے بھوگ لگانا چاہا۔ ٹھیک اُسی وقت ننھّے نمائی کہیں سے آ پہونچے۔ انھوں نے بھوجن میں ہاتھ ڈالا اور کھانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر برہمن کچھ جھنجھلا اُٹھا —— ارے، یہ کس کا بچّہ ہے؟ ان دنوں چوکے، بھوجن وغیرہ کی صفائی کا بہُت دھیان رکھا جاتا تھا۔ برہمن اپنے ہاتھ سے بھوجن بنایا کرتے تھے۔ چوکے میں کوئی دُوسرا آ گھُستا تو سارا کھانا ناپاک ہو جاتا۔ جگن ناتھ مشر نے جب سُنا تو وہ دوڑے ہوئے آئے اور نمائی کو پکڑ کر پیٹنا چاہا مگر برہمن نے انھیں روک دیا۔

شچی دیوی کے بہُت کہنے سُننے پر برہمن نے دوبارہ بھوجن بنایا۔ اس وقت نمائی کو الگ لے جا کر رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ برہمن آنکھیں بند کر کے پھر بھگوان کو بھوگ لگانے لگے۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت نمائی نہ جانے کیسے چھوٹ کر وہاں آ گئے اور آ کر کھانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُنھوں نے رسّی کیسے کھول لی۔ برہمن کا کھانا پھر ناپاک ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ آج اس کی قسمت میں کھانا نہیں لکھا ہے۔ اس لئے اس نے بھوکا ہی رہنے کا ارادہ کیا۔ مگر شچی دیوی اور مشر کے کہنے پر برہمن نے پھر کھانا تیار کیا ادھر نمائی کو پھر رسّی سے باندھ دیا گیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ نمائی رسّی سے چھوٹ کر بھاگنے نہ پائے۔ ان کا بڑا بھائی وہیں پاس بیٹھ گیا۔ ڈر تھا کہ کہیں نٹ کھٹ نمائی کہیں پھر وہی گُل نہ کھلائے۔

اب کے بار جب برہمن نے بھگوان کو بھوگ لگانے کے لئے آنکھیں بند کیں تب اس نے اپنے دھیان میں ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے خود

بھگوان وشنو اس کے سامنے آ گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تمہارے بُلانے پر میں بچے کے رُوپ میں دو بار تو تمہارے پاس آ چکا ہوں لیکن تم نے پہچانا نہیں۔ کہو اب کیا چاہتے ہو؟

اب برہمن کی سمجھ میں بات آئی کہ نمائی کے رُوپ میں خود بھگوان نے اُس کے بھوجن کا بھوگ لگایا تھا۔ برہمن نے بھگوان سے معافی چاہی۔ بھگوان اس کی منھ مانگی مراد پُوری کر کے غائب ہو گئے۔

نمائی اپنے بچپن کی شرارتوں سے ہر کسی کا دل موہ لیتے تھے۔ پاس پڑوس میں چھینا جھپٹی کر کے جو چیز مل جاتی اُسے کھا جاتے۔ وہ ذات پات کا کچھ خیال نہ کرتے۔ نمائی پڑھائی میں بھی بہت تیز تھے۔ چھوٹی سی عمر میں وہ سنسکرت کے اچھے خاصے وِدوان ہو گئے۔ ابھی وہ گیارہ برس کے ہوئے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ان کے بڑے بھائی شادی کے ڈر سے گھر سے بھاگ چُکے تھے۔ ان کے بارے میں صرف یہی خبر ملی کہ کہیں انھوں نے سنیاس لے لیا ہے۔ مگر لاکھ ڈھونڈنے پر بھی ان کا پتہ نہیں چلا۔

چھوٹی سی عمر میں نمائی کے اُوپر گھر کا سارا بوجھ آ پڑا۔ وہ گھبرائے نہیں۔ انھوں نے اپنی ماتا کی ہمت بندھائی اور جی جان سے ان کی سیوا کرنے لگے۔ پڑھنے کا وقت بھی نکال لیتے۔ انھوں نے نیائے شاستر (ہندو فلسفے کی ایک شاخ) کے مشہور عالم واسدیو کی پاٹھ شالہ میں فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور سولہ سال کی عمر میں ہی نیائے شاستر کے بہت بڑے عالم بن گئے۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں نمائی نے نیائے شاستر کے اُوپر ایک عمدہ کتاب لکھی۔ ان کے ہم جماعت رگھوناتھ شرومنی کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ نمائی نے کوئی کتاب لکھی ہے تو وہ نمائی پنڈت کے پاس آئے۔ نمائی نے اپنے دوست کے کہنے پر

اپنی کتاب پڑھ کر انھیں سُنادی۔ سُن کر رگھوناتھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نمائی کو بڑا تعجب ہُوا۔ انھوں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو رگھوناتھ نے کہا۔ نمائی! میں نے بھی نیائے شاستر پر ایک کتاب لکھی تھی۔ مگر تمہاری کتاب کے ہوتے ہوئے اُسے کوئی نہیں پوچھے گا۔ تمہاری کتاب بہت اچھی ہے۔ میری ساری محنت بے کار ہو گئی۔ بس یہی سوچ کر آنسو نکل آئے۔

نمائی پنڈت بڑے نرم دل کے تھے۔ اس لئے وہ رگھوناتھ کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ وہ بولے — پیارے دوست! بس اتنی سی بات کے لئے تم پریشان ہو؟ یہ کہہ کر اُنھوں نے اُسی وقت رگھوناتھ کے سامنے اپنی کتاب گنگا میں پھینک دی۔ رگھوناتھ شرومنی نمائی پنڈت کا یہ پیار اور تیاگ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نمائی کی وہ کتاب ہمیشہ کے لئے گنگا کی لہروں میں سما گئی۔ لیکن رگھوناتھ شرومنی کی نیائے شاستر پر لکھی ہوئی 'دیدھتی' نامی کتاب آج بھی ملتی ہے اور بہت مشہور ہے۔

اس واقعہ کے بعد نمائی پنڈت پھر گرو کے پاس پڑھنے نہیں گئے۔ وہ گھر میں ہی بیٹھ کر مطالعہ کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے خود ایک اسکول کھول لیا۔ جس میں بہت سے طالب علم آنے لگے۔

ایک بار نمائی پنڈت اپنے والد کا شرادھ کرنے کے لئے گیا گئے۔ وہ گیا کیا گئے سارا گھر سونا ہو گیا۔ ان کے چلے جانے سے سبھی لوگ اُداس نظر آنے لگے۔

آخر شرادھ کرنے کے بعد ایک دن نمائی پنڈت گھر لوٹے۔ لوٹ تو آئے لیکن اب وہ پہلے کے نمائی پنڈت نہیں رہے۔ ان میں ایک عجیب تبدیلی آ گئی تھی۔ گیا سے واپس آ کر اُنھوں نے کچھ دن تو اسکول چلایا لیکن جلدی ہی اُسے بند کر دیا۔ ان کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ پڑھاتے پڑھاتے ایک دم کسی خیال میں گم ہو جاتے۔ اکثر وہ پڑھانا بھول جاتے اور اُٹھ کر ناچنے لگتے۔ ناچتے ناچتے کیرتن کرنے لگتے اور بھگوان کا نام مدھر سنگیت

کے رُوپ میں ان کے گلے سے بہہ نکلتا۔ "ہرے کرشن ہرے کرشن" کا کیرتن کرتے ہوئے
گاتے اور ناچتے وقت اکثر وہ بے سُدھ ہو کر گر پڑتے تھے۔ لیکن جیسے ہی ہوش آتا پھر
ناچنے لگتے۔ کرشن کی جدائی میں تڑپ اُٹھتے۔ اس قدر رنج و غم کا مظاہرہ اور
اس طرح رو رو کر پکارتے کہ آدمی تو کیا پتھر بھی پگھل جائے۔ اب اُنھیں نہ کھانے
کو سُدھ رہی نہ پینے کی۔

دیکھتے دیکھتے بنگال کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک بھگوت بھگتی
کی ایک دھارا بہہ نکلی۔ نمائی کا جنم استھان نودیپ اس کا مرکز تھا۔ یہاں گھر گھر میں
ہری نام کا کیرتن ہونے لگا۔ کیرتن منڈلیاں بازار میں نکلتیں۔ آگے آگے نمائی پنڈت
ناچتے گاتے جاتے۔ لوگ ان کی راہوں میں پھول بچھا دیتے۔ دُور دُور سے بھگت لوگ
نودیپ آنے لگے۔ وہ نمائی پنڈت کو اس طرح گھیرتے جیسے شمع پروانے کو۔ ان کے لئے
بھگوان کی بھگتی سب سے بڑا دھرم تھا۔ اُنھوں نے ایسا دھرم چلایا جس سے اُونچ نیچ
ذات پات، غریب امیر، ہندو مسلمان کے فرق کو مٹا ڈالا۔ اُن کے بھگتی رس کا اثر
سب کے لئے برابر تھا۔ سب لوگ اپنے اختلافات کو بھلا کر علم و عرفان کے اس دھارے
میں غوطے لگاتے۔ اور ان کے دلوں سے بُرائی، بغض و حسد کا میل دھلنے لگا۔

نمائی پنڈت کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ عقیدت سے لوگ اُنھیں اب
گورنگ مہاپربھو کہنے لگے تھے۔ کچھ اُن کی اِس عزت اور شہرت سے جلنے لگے۔ انھوں نے
مسلمان قاضی سے شکایت کی کہ نمائی کے کیرتن سے کچھ لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔
اتنا ہی نہیں وہ تو مسلمانوں کو بھی کرشن بھگت بنا رہے ہیں۔

قاضی نے یہ سُنتے ہی سارے شہر میں کیرتن بند کر دینے کا حُکم دے دیا۔ مگر
گورنگ مہاپربھو نے اس حکم کے جواب میں ایک عجیب کام کیا۔ اُنھوں نے قاضی صاحب
کے مکان کے سامنے بیٹھ کر کیرتن شروع کر دیا۔ ان کے کیرتن میں کچھ ایسا جادو تھا۔

کہ اسے سنتے ہی قاضی مکان سے باہر نکلا اور ان کے کیرتن میں شامل ہو کر ناچنے لگا۔ شکایت کرنے والے من ہی من جل بھن کر رہ گئے۔ اس طرح نمائی نے بنگال میں ہندو اور مسلمانوں کو کرشن بھگتی کی ڈوریں باندھ دیا۔

بنگال میں کالی کی پوجا میں بہت سے جانوروں کی قربانی دینے کا رواج تھا۔ گورنگ مہاپربھو جانوروں کی قربانی کو غلط سمجھتے تھے۔ ان کے اثر سے یہ رسم اور ایسی بہت سی دوسری سماجی خرابیاں دور ہوئیں۔

ایک دن گورنگ نے سنیاس لے لیا۔ سنیاس لینے سے پہلے اپنی ماں کے اصرار پر انھوں نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر گرہستی میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سنیاس لینے کے بعد وہ چیتنیہ کہلانے لگے اب چیتنیہ مہاپربھو گھوم گھوم کر ویشنو دھرم اور بھگوت بھگتی کا پرچار کرنے لگے۔ اس دھن میں وہ جنگلوں اور ندیوں کو پار کرتے ہوئے وہ دکھن بھارت پہونچے۔ ان کے اثر میں آکر بہت سے خواب لوگ بھی اچھے اور نیک بن گئے۔

ان کی بھگتی اور مستی کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ اسی مستی میں وہ ایک بار ایک جھیل میں اور دوسری بار ایک سمندر میں کود پڑے تھے۔ خوش قسمتی سے دونوں بار وہ زندہ باہر نکال لئے گئے۔ چوبیسوں گھنٹے ان پر کرشن کی بھگتی کا نشہ چڑھا رہتا تھا اور اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

چیتنیہ کی موت جگن ناتھ پوری میں رتھ یاترا کے موقعہ پر ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۴۸ برس کی تھی۔ ان کا اثر سارے بنگال پر پڑا۔ یہی نہیں، بھارت کے دوسرے حصوں میں بھی کرشن بھگتی کی ایک بڑی لہر اٹھی۔ جس نے ملک میں بھید بھاؤ کی لعنت کو بہت حد تک ختم کر دیا اور پریم کی ایسی دھارا بہا دی جو آج تک نہ سوکھ سکی۔

بھارت ورش کی ایکتا کو مضبوط بنانے میں دھرم اور سنسکرتی کا بڑا

بھاری ہاتھ رہا ہے۔ لیکن جب کبھی ہمارے ملک کے الگ الگ حصّوں کو ایک دُوسرے سے جوڑنے والی کڑی کمزور پڑنے لگتی تھی تب ایک نہ ایک ایسی شخصیت ضرور پیدا ہوجاتی رہی جو عام جنتا کو دھرم کی ایکتا کا پیغام دے اور صحیح راستہ دکھائے۔ ایسی شخصیتوں میں چیتنیہ مہا پربھو کو نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کا نام ہم ہندوستانی ہمیشہ بڑی عزّت سے لیتے رہیں گے۔

میراں بائی

میراں بائی ہندی کی مشہور بھگت شاعرہ ہوئی ہیں۔ وہ راجستھان کی رہنے والی تھیں۔ میراں کی زندگی کے بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ ان کی پیدائش وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ یقینی طور پر کہنا مشکل ہے۔ لیکن ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں وہ یقیناً زندہ تھیں۔

راجستھان کے جودھ پور شہر کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اسے راؤ جودھاجی نے بسایا تھا۔ میراں انہیں راؤ جودھاجی کے خاندان میں پیدا ہوئی تھیں۔ راؤ جودھاجی راٹھور خاندان کے تھے۔ ان کے بیٹے راؤ دُودا نے میڑتا میں سلطنت قائم کی۔ راؤ دودا کے بیٹے راؤ رتن سنگھ کو میڑتا کی سلطنت کی طرف سے گذر بسر کے لئے بارہ گاؤں ملے تھے۔ انہیں میں سے کُڈکی نام کے گاؤں میں راؤ رتن سنگھ کے گھر میراں بائی نے جنم لیا۔ میراں بائی کی ماتا کا نام کُسُم کنور تھا۔ وہ ٹانکنی کی راجپوتنی تھیں۔

کہتے ہیں کہ میراں بچپن سے ہی جب وہ گڑیا کا بیاہ رچانے کا کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ گوپال کی مورتی کے پاس بیٹھنا پسند کرتی تھیں۔

کم سنی میں ہی میراں کے ماتا پتا کا انتقال ہو گیا تھا۔ خیال ہے کہ اپنے والد کی موت کے وقت میراں کی عمر تین برس کی تھی اور ماتا کی موت کے وقت دس برس کی۔ موت کے بعد میراں اپنے دادا راؤ دُودا کے پاس میڑتا رہنے لگی۔ میڑتا مارواڑ میں تھا۔ وہیں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ راؤ دودا وِشنو کے بہت بڑے بھگت تھے۔ وہ سادھو سنتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے میراں پر بھی

کرشن کے پریم کا رنگ چڑھنے لگا۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں راؤ دودا بھی اس دُنیا سے چل بسے۔ راؤ دودا کی موت کے بعد ان کے بڑے بیٹے ویرم دیوجی تخت پر بیٹھے۔ میراں اب سیانی ہو چلی تھی ویرم دیو کو ان کے لئے مُناسب رشتہ ڈھونڈھنے کی فکر ہوئی۔ ان دنوں چتوڑ کے سسوڈیا خاندان کی شہرت اور عزت چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سسوڈیا خاندان کے سُوریہ رانا سانگا بڑی شان و شوکت والے تھے۔ ان کی بہادری کی دھاک چاروں طرف جمی ہُوئی تھی۔ ویرم دیو نے میراں بائی کا بیاہ انہیں رانا سانگا کے سب سے بڑے راج کمار بھوج راج کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح میراں مارواڑ کی بیٹی ہو کر میواڑ میں ہی بیاہی گئی تھیں۔

رانا سانگا کا خاندان بہادری اور بھگتی دونوں کے لئے ہی مشہور تھا۔ میراں کے چچا ویرم دیو نے سوچا تھا کہ یہ گھر میراں کے لئے ہر طرح مناسب رہے گا۔ لیکن میراں کی قسمت میں سُکھ نہیں لکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ میراں کے پتی راؤ بھوج راج انھیں پسند کرتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ لیکن یہ آرام میراں زیادہ دنوں نہ اُٹھا سکیں کم عمر میں ہی رانا بھوج راج کی موت ہو گئی۔ ادھر بابر سے ہار جانے کی وجہ سے میراں کے سسر رانا سانگا کو اتنا دُکھ پہونچا کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ میراں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

میراں کے دل میں کرشن کی بھگتی کا انکر پہلے پھُوٹ چکا تھا۔ ان واقعات نے ان کے احساسات کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بے چین ہو کر اپنی ساری زندگی اور جذبات وخیالات کرشن کی بھگتی اور اس کی مدح کے لئے وقف کر دی۔ اور ان کے گیتوں میں ہجر کے جذبات بہہ نکلے۔ کرشن کو سب کچھ مان کر میراں نے گایا۔

جو تم توڑو پیا میں نہیں توڑوں!

تم سوں پریت توڑ کرشن، کون سنگ جوڑوں
تم بھئے تر دور میں بھئی پنکھیا
تم بھئے سروّر میں تیری مچھیا
تم بھئے گرور میں بھئی مورا
تم بھئے چندا میں بھئی چکورا
تم بھئے موتی پربھو ہم بھئے دھاگا
تم بھئے سونا ہم بھئے سوہاگا
میراں کے پربھو برج کے باسی
تم میرے ٹھاکر میں تیری داسی

رانا سانگا کے بعد بھوج راج کے چھوٹے بھائی رتن سنگھ میواڑ کے راجہ ہوئے لیکن وہ بھی زیادہ دن زندہ نہیں رہے۔ اس لئے رتن سنگھ کے سوتیلے بھائی وکرم دتیہ وکرماجیت راجہ ہوئے۔ جیسے جیسے میواڑ کی راج نیتی اور خاص کر چتوڑ کے راج گھرانے میں تبدیلیاں ہوئیں۔ ویسے ویسے میراں کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو کر اپنے پربھو کی طرف ہوتا گیا۔ سادھو سماگم ہری کتھا اور کرشن بھگتی کے غیر معمولی اثرات کے تحت میراں کو دُنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آنے لگیں۔

دھیرے دھیرے محل میں اور محل کے باہر بھی کانا پھوسی ہونے لگی۔ جتنے مُنھ اُتنی باتیں۔ لوگ میراں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہنے لگے۔ لیکن میراں نے گوپال سے جو پریم کا ناتا جوڑا تھا۔ اُسے وہ کسی بھی قیمت پر توڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اس حد تک آگے جا چکی تھیں کہ اب انہیں دنیا کی کوئی پروا نہ تھی۔

میرے گردھر گوپال دُوسرو نہ کوئی
جاکے سر مور مکٹ میرو پتی سوئی

تات مات بھرات بندھو اپنا نہیں کوئی
چھانڑ دیئی کُل کی آن کیا کریئے کوئی
سنتن ڈھنگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی
چنری کئے ٹُک ٹُک اوڑھ لین لوئی
موتی مونگے اتاریں مالا پوئی
آنسون جل سینچ سینچ پریم بیل بوئی
اب تو بیل پھیل گئی آنند پھل ہوئی
دُودھ کی متھنیا بڑے پریم سے بلوئی
مکھن جب کاڑھ لیو چھاچھ پیئے کوئی
آئی میں بھگت کاج جگت دیکھ موہی
داسی میراں گردھر پربھو تارو اب موہی

لیکن لوک لاج کی چنتا میراں کے دیور رانا وکرما دتیہ کو تو تھی۔ راج گھرانے کی بیوہ بہو اس پر جوانی اور وہ اتنی حسین، سادھو سنتوں کے ساتھ اُٹھے بیٹھے اور کیرتن کرے یہ بات ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اُنھوں نے میراں کو ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کے پاس کئی عورتوں کو بھیجا۔ خود اپنی بہن اودا بائی کو بھی ان کے قریب رکھا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ میراں پر پریم کا جو نشہ چڑھا ہوا تھا وہ چڑھا ہی رہا اُترا نہیں۔ وہ گا اُٹھی ——

جوگی مت جا مت جا، پائے پڑوں میں چیری تیری ہوں
پریم بھگت کو پینڑو ہی نیارو، ہم کوں گیل بتا جا
اگر چندن کی چتا رچاؤں، اپنے ہاتھ جلا جا
جل بل بھئی بھسم کی ڈھیری، اپنے انگ لگا جا

میراں کے پربھو گردھر ناگر، جوت میں جوت ملا جا

غصّے میں آکر رانا نے میراں بائی کو چرن امرت کے رُوپ میں زہر اور پٹاری میں کالا ناگ بھیجا۔ لیکن میراں کے رکھوالے تو خود بھگوان کرشن تھے۔ ان کا بال بھی بیکا نہ ہؤا۔ ڈرانے دھمکانے اور طرح طرح کی تکلیفیں دینے کا میراں پر اُلٹا ہی اثر ہؤا۔ سانوریا کے پریم کا رنگ روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا میراں پر کوئی اثر نہ تھا۔

ساسو (ساس) لڑے میرو (میری) نند کھجاوے (غصّہ کرے) رانا رہیا رسائے۔
پہرہ بھی راکھیو، چوکی بٹھاسیو (بٹھائیو) تالا دیو جڑائے (لگائے)

ان کا جسم راج محل میں ہوتے ہوئے بھی ان کا من کہیں اور تھا اور اپنی تکلیفوں کو ہنس کر ٹال دینے میں لگی ہوئی تھیں۔

پگ گھنگرو باندھ میراں ناچی رے
لوگ کہیں میراں بھئی باوری
ساس کہے کل ناسی رے
زہر کا پیالہ رانا جی نے بھیجا
پی کر میراں ہنسی رے

کرشن کے پریم میں میراں کی آتما بلند ہو چکی تھی کہ دُنیاوی پابندیوں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر راجہ ناخوش گئے تو ان کی سلطنت انھیں مبارک: زیادہ سے زیادہ اپنی سلطنت کے حدود سے باہر نکال دیں گے۔ لیکن اگر بھگوان روٹھ گئے تو پھر کہاں ٹھکانا ملے گا۔ اسی لئے میراں نے رانا کے حکم کو ٹھکرا دیا اور گووند کے گن گانے میں لگ گئیں۔

میں تو گووند کے گُن گانا

راجہ ڈوبڑ نگری رانکھے
ہری ڈوبڑ کہاں جانا
ڈبیا میں کالا ناگ جو بھیجا
شالی گرام کر جانا

رانا وکرمادتیہ اور میراں کے راستے الگ الگ تھے۔ رانا کو لوک لاج اور خاندان کی عزت کا خیال تھا۔ میراں ان باتوں سے بلند ہو چکی تھیں۔ اسی لئے اب میراں کو اپنا راستہ چُننا تھا۔ انھیں یہ طے کرنا تھا کہ وہ رانا کی پابندیوں کو قبول کر لیں یا راج محل سے اپنا تعلق ختم کر کے آزاد ہو جائیں۔

جس وقت میراں اس ذہنی کشمکش میں گرفتار تھیں۔ اسی وقت ان کے چچا نے ان کی مُصیبت کا حال سُن کر انھیں اپنے میڑتا بلا لیا اور بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ میراں کے چتوڑ چھوڑ دینے کے بعد چتوڑ پر بڑی مُصیبتیں آئیں۔ گجرات کے سُلطان نے چتوڑ چھین لیا۔ آخر میں رانا وکرمادتیہ بھی مارے گئے۔

میڑتا پر بھی مُصیبتوں کے بادل چھا گئے۔ جودھ پور کے راؤ مالدیو نے ویرم دیو سے میڑتا چھین لیا۔ ایسی صورت میں میراں نے تیرتھ یاترا پر جانے کا فیصلہ کیا۔ بس وہ میڑتا سے نکل پڑیں۔ من میں پریم کی جوت تو موجود ہی تھی۔ جنگل جنگل گھومنے اور کرشن پریم کے گیت گانے لگیں۔

ہے رے میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئے
سولی اوپر سیج ہماری، کس بدھ سونا ہوئے
گگن منڈل پر سیج پیا کی کس بدھ ملنا ہوئے
گھائل کی گت گھائل جانے، کی جن لائی ہوئے
جوہری کی گت جوہری جانے، کی جن جوہر ہوئے

درد کی ماری بن بن ڈولوں، بید ملیا نہیں کوئے
میراں کے پربھو پیر مٹے گی، جب بید سنولیا ہوئے

اپنے کو گوپی سمجھنے والی میراں سنوریا کو ڈھونڈھتی ہوئی برج کی طرف چلیں اور برندابن جا پہونچیں۔ برندابن کی کنج گلیوں میں کرشن کی لیلا گا کر اُنھیں منانے لگیں۔

سیام منے چاکر راکھو جی
گردھاری لال چاکر راکھو جی
چاکر رہ سوں باگ لگاسوں، نت اُٹھ درشن پاسوں
بندرابن کی کنج گلین میں تیری لیلا گاسوں
چاکری میں درسن پاؤں سمرن پاؤں خرچی
بھاؤ بھگت جاگیری پاؤں تینوں باتاں سرسی
مور مُکٹ پتامبر سوہے، گلے بے جنتی مالا
ورنداون میں دھینو چراوے، موہن مُرلی والا
ہرے ہرے نت باگ لگاؤں، بیچ بیچ راکھوں کیاری
سانوریا کے درسن پاؤں، پہر کو سمجھی ساری
جوگی آیا جوگ کرن کوں، تپ کرنے سنیاسی
ہری بھجن کوں سادھو آیا، ورنداون کے باسی
میراں کے پربھو گہر گمبھیرا، سدا رہو جی دھیرا
آدھی رات پربھو درسن دیہیں، پریم ندی کے تیرا

لیکن میراں کے لئے ورنداون میں بھی ٹھہرنا مشکل تھا۔ وہ تو ان سب جگہوں کا درشن کرنا چاہتی تھی، جہاں کرشن نے اپنی زندگی گذاری تھی۔ اس لئے میراں ورنداون سے دوارکا کے لئے چل پڑیں۔ دوارکا میں بھی وہ اسی طرح کرشن بھگتی کے گیت لکھتی رہیں۔

اس درمیان میں چتوڑ اور میرٹا دونوں جگہوں میں پرانی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ وہاں سے ان کو لینے کے لئے آدمی بھیجے گئے۔ میراں پہلے تو انکار کرتی رہیں مگر آخیر میں راضی ہوگئیں لیکن دوارکا سے رخصت ہونے کے لئے جب وہ رنچھوڑ کے مندر میں پوجا کرنے گئیں تو وہ اپنی عبادت میں اتنی کھوگئیں کہ کہتے ہیں۔ مورتی نے انھیں اپنے اندر سمولیا۔ اس طرح میراں کی جیون لیلا گجرات میں ختم ہوگئی۔

میراں نے اپنے شعروں میں رے داس کو بھی اپنا گرو مانا ہے۔ لکھتی ہیں۔

مہارو من لاگو ہری جی سوں، اب نہ رہوں گی اٹکی
گرو ملیا رے داس جی، دیہیں گیان کی گٹکی

یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے جیو گوسوامی سے دیکشا لی تھی۔ اس طرح، ایک طرف ان کا تعلق ان بھگتوں سے ثابت ہوتا ہے جو خدا کو نرگن مانتے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں سے بھی ثابت ہوتا ہے جو خدا کو سگن مانتے ہیں۔ ان کے بھجنوں میں کسی ایسے گرو کا بھی ذکر ہے جو ناتھ پنتھی معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کسی خاص مت یا فرقے سے نہیں تھا۔

دوسرے سنت کویوں کی طرح میراں نے بھی بھارت کو ایسا ساہتیہ دیا ہے جو امر رہے گا۔ میراں کی بھاشا صاف اور آسان ہے۔ جو دلوں کو چھو لیتی ہے۔ ان کی زندگی مارواڑ، میواڑ، برج، اور گجرات میں گذری تھی، اس لئے ان کی زبان پر ان چاروں کا اثر ہے۔ ان کے بھجنوں میں بڑا اخلوص اور بڑی اثر انگیزی ہے۔ اس لئے یہ آج بھی گھر گھر گائے جاتے ہیں۔

کرشن دیو رائے

کرشن دیو رائے دکھن بھارت میں وجے نگر سلطنت کے ایک بہت بڑے بادشاہ تھے۔ اشوک اور چندر گپت کی طرح انھوں نے بھی اپنی سلطنت کی ترقی اور عوام کے سُکھ کی طرف خاص توجہ دی۔ اس لئے ان کا دَور حکومت وجے نگر سامراجیہ کا سُنہری دَور کہلاتا ہے۔

ان کے راج تلک کے وقت وجے نگر سامراجیہ قریب قریب ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ مگر اس بادشاہ نے دس سال کے اندر ہی اندر وجے نگر کی شان سارے جنوبی ہند میں قائم کر دی۔

کرشن دیو رائے کا سب سے پہلا کام جہاد کے بہانے ہر سال لوٗٹ مار کرنے کے لئے آنے والے یونوں کو ہرانا اور اپنے سلطنت کی حدوں کو بڑھانا تھا۔

بیجاپور کے اندرونی جھگڑوں سے فائدہ اُٹھا کر کرشن دیو رائے نے رائے چور کے بعد گلبرگ اور پھر بیدر پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اودے گیری کو فتح کیا۔ اس لڑائی میں اُڑیسہ کی رانی اور شاہی خاندان کے کچھ فرد قید کر لئے گئے تھے۔ مگر کرشن دیو رائے نے کسی قسم کی بے عزّتی نہیں کی۔ اُنھوں نے گج پتی کے راج کمار ویر بھدر کو قید کر لیا گیا تھا، ایک پرانت کا راج پال (گورنر) بنا کر اپنی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ جب ان کی فوجیں کلنگ کی راج دھانی کٹک تک پہنچیں تو وہاں کے راجہ نے کرشن دیو سے صلح کر کے اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ کرشن دیو رائے نے بھی اس کا جیتا ہوٗا حصّہ اسے لوٹا دیا۔

اکبر اعظم کی طرح کرشن دیو رائے بھی سب دھرموں کی عزّت کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے

نزدیک یہ ایک اچھی اور مناسب پالیسی تھی۔ اُنھوں نے جین دھرم کو بڑھاوا دیا۔ وجے نگر کے سمراٹوں کا اعلان تھا — "جب تک سورج اور چاند رہیں گے تب تک ویشنو دھرم جین دھرم کی حفاظت کرے گا۔"

دکھن بھارت میں پرتگالیوں کے آنے کے ساتھ ساتھ عیسائی دھرم بھی بھارت میں پھیلا۔ سمراٹ عیسائی پادریوں کو عزت کے ساتھ دربار میں بلایا کرتے تھے اور ان کی دھرم کی باتیں سُنتے تھے۔ اُنھوں نے پادریوں کو اپنے دھرم پرچار کرنے اور گرجا گھر بنانے کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ کرشن دیو رائے نے مسلمانوں کو اپنی فوج میں کافی تعداد میں بھرتی کر رکھا تھا۔ پتہ چلتا ہے کہ ان کے وقت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے لئے مسجدیں بھی بنوائی تھیں۔ کرشن دیو اگرچہ بذاتِ خود ویشنو تھے مگر اُنھوں نے شو مندروں کی مالی مدد کی۔ یہ بھی درست ہے کہ کٹر ویشنو ہونے کے ناتے ویشنو دھرم کو ماننے والے ادیبوں، مصوروں، سنگ تراشوں وغیرہ کے لئے ان کے دل میں زیادہ ہمدردی تھی۔

کرشن دیو رائے ہوشیار حکمران اور حکمت عملی کے ماہر تھے۔ ان کا کہنا تھا — اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اپنی سرحد کے نزدیک کے علاقوں کو آپ جیت سکتے ہیں تو ایسا کرنے سے کبھی نہ چوکیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اچھا یہی ہے کہ آپ اپنے پڑوسی راجاؤں سے دوستی قائم رکھیں اور یہ تعلقات بگڑنے نہ پائیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ راجہ کو اپنے وزیروں کے اُوپر خفیہ آدمی رکھنے چاہئیں کیونکہ ممکن ہے کہ جن وزیروں پر بھروسہ اور اعتماد ہے وہی کبھی دھوکا دے جائیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے عقل مند بادشاہ ہونے کی ایک مثال دیکھئے۔ وہ غیر ممالک کے سفیروں سے بہت اچھا سلوک کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دُشمن راجہ کو بھی دوست بنانے کا بھی سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس کے راج دوت (سفیر) کی پوری پوری عزت کی جائے۔ انھوں نے اس بات کو

مدّنظر رکھتے ہوئے برار، بیدر اور گول کنڈا کے سلطانوں کے سفیروں کو بھی بہت سے تحفے دیئے۔ حالانکہ ان سلطانوں نے سمراٹ کرشن دیو کو اپنے سفیروں کے ذریعے دھمکی سے بھرے ہوئے خطوط بھیجے تھے۔

کرشن دیو رائے کے دربار کی بڑی شان تھی۔ جس کی غیر ملکی سفیروں اور سیاحوں نے بھی بڑی تعریف کی ہے۔ ان لوگوں نے وجے نگر کی شان و شوکت، تقریبوں کی دھوم دھام، فوجی طاقت اور راجہ کی بہادری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

ان دنوں دکھن بھارت کا زیادہ تر حصّہ کرشن دیو رائے کے ماتحت تھا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کے صوبوں میں گورنر مقرر کر رکھے تھے۔ انھیں ایک خاص تعداد میں گھوڑے پیدل اور ہاتھی رکھنے پڑتے تھے۔ اور سالانہ آمدنی کا کچھ حصّہ سمراٹ کو دینا پڑتا تھا۔ سمراٹ نے اپنے ماتحت راجاؤں میں سے کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ انھوں نے دشمن سے بھی اچھا سلوک کیا اور جیتے ہوئے شہروں کے باشندوں پر کبھی ظلم نہیں ڈھائے۔ ان کی فوجی طاقت، شاندار شخصیت، نیک طبیعت اور عوام کی بھلائی کے لئے کئے گئے کاموں نے انھیں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ کرشن دیو رائے کی بارہ بیویاں تھیں۔ جن میں تین خاص تھیں۔ ان سبھی کے لڑکے راج کمار سمجھے جاتے تھے۔

کرشن دیو رائے بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے۔ وہ کسی کپڑے کو ایک سے زیادہ بار نہیں پہنتے تھے۔ عام طور پر وہ سفید رنگ کے کپڑے پہنتے تھے جن میں پھول کڑھے رہتے تھے۔ اچھے ریشمی کپڑے بھی انھیں بہت پسند تھے۔ جن میں سونے کے سنہرے پھول بنے رہتے تھے۔ جب وہ لڑائی کے میدان میں آتے تب زرہ بکتر کے اوپر ہیرے جواہرات اور سونے سے سجے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ انھیں قیمتی کپڑوں اور خوشبو کا بڑا شوق تھا۔ وہ گوشت خور تھے اور طرح طرح کے گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

سمراٹ سورج نکلنے کے بہت پہلے ہی تقریباً آدھ سیر تل کا تیل پیتے تھے اور تل کے تیل کی مالش بھی کرتے تھے۔ وہ تلوار چلاتے جس سے پیا ہوا تیل زیادہ تر پسینے کے ساتھ جسم سے باہر نکل آتا۔ اس کے بعد وہ ایک پہلوان سے کشتی لڑتے اور پھر دن نکلنے تک گھوڑے سواری کیا کرتے تھے۔ اور پھر وہ اشنان کرکے پوجا پاٹھ کرتے تھے پھر دربار میں راجیہ کے افسروں سے ضروری بات چیت کیا کرتے تھے۔

کرشن دیو رائے کو کشتی کا بڑا شوق تھا۔ وہ پہلوانوں کی کشتی دیکھنے میں بھی خوب مزا لیتے تھے۔ ان کے پاس ایک ہزار پہلوان تھے۔ جانوروں کی لڑائیاں اور دوڑوں میں بھی ان کو خاص دل چسپی تھی۔

کرشن دیو رائے کا دورِ حکومت دکھن بھارت کے ادب کے تاریخ کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اُن کا دربار سنسکرت، تیلگو، تامل اور کنڑ کے عالموں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ خود اچھے مصنّف تھے اور ادیبوں کی عزت کرتے تھے۔ تیلگو میں لکھی ہوئی ان کی 'آموکت مالیادا' سے پہلے اُنھوں نے لگ بھگ ایک درجن کتابیں سنسکرت میں لکھی تھیں۔

ان کے دربار میں سلطنت کے آٹھ مہان کوی رہتے تھے۔ جنھیں 'اشٹ دگج' کہا جاتا تھا۔ سمراٹ ان کویوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تیلگو میں لکھی ان کی "آموکت مالیادا" نامی تصنیف تیلگو زبان کی پانچ بڑی کتابوں میں گنی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب میں مظاہر فطرت کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے۔ خاص طور سے مختلف موسموں چاند اور شام کے وقت کا ذکر بڑے سُندر ڈھنگ سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس عظیم بادشاہ کے دورِ حکومت میں نہ صرف 'اوشدھی شاستر' پر (علم حکمت) کتابیں لکھی گئیں، بلکہ کھانا پکانے کے فن پر کتابیں لکھی گئیں۔

کرشن دیو رائے کے دورِ حکومت میں فنِ تعمیر، مجسمہ سازی اور مصوّری کی بھی بہت

ترقی ہوئی۔ ان کے محل کے دروازے پر ان کی اور ان کے پتا کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس محل میں ناچ کے مختلف مدراؤں کی تصویریں دیواروں پر بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ ناچ کی کلا سے بھی سمراٹ کو بہت دل چسپی تھی۔ اس کے علاوہ دیواروں پر قسم قسم کے پرندوں کی بنی ہوئی تصویریں بھی بہت اچھی تھیں۔

ایک عظیم معمار ہونے کے ناتے کرشن دیو رائے کا مقابلہ مغل بادشاہوں سے کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی راج دھانی کی سندرتا کو بہت بڑھایا۔ انھوں نے مندر اور محل بنوائے۔ پرتگالی انجینروں کی مدد سے اُنھوں نے وجے نگر کے پاس کے علاقہ کی بنجر زمین کی سینچائی کا بندوبست کیا۔ اُنھوں نے اپنی ماں نگل دیوی کے نام پر نگ پور نام کا ایک شہر بسایا۔ اس نئے شہر کے لئے پانی ایک نئے تالاب سے آتا تھا۔ اُنھوں نے وٹھل سوامی کے مندر میں پھولوں کے نہایت خوب صورت نمونے بنوائے۔ اس مندر میں کئی سالوں تک چتر کاری کا کام ہوتا رہا تھا۔

چالیس سال کی عمر میں کرشن دیو رائے نے اپنے چھ سالہ بچّے کے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا اور خود منتری کا کام کرنے لگے۔ اس وقت وہ بوڑھے نہیں ہوئے تھے مگر ممکن ہے کسی ایسی بیماری میں مبتلا رہے ہوں جس سے اُنھیں موت کا ڈر ہو۔ کہتے ہیں کہ بچّے کو تخت کا حق دار بنا دینے کی وجہ سے کرشن دیو رائے کے نمک حرام وزیر سالوواتما کو اپنی حسرتیں مٹی میں ملتی نظر آئیں اور اس نے اس بچّے کو زہر دلوانے کی کوششیں کیں۔ اس وقت کرشن دیو رائے بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے کھلے دربار میں سالوواتما پر الزام لگا کر اسے اور اس کے سارے پریوار کو جیل میں ڈال دیا۔

جب تک کرشن دیو رائے زندہ رہے تب تک کسی باہری راجہ کو وجے نگر کی طرف نظر اُٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی موت کے بعد دشمنوں نے

وجے نگر کے چاروں طرف سے حملے شروع کر دیئے۔ ان کے لڑکے کی بھی تھوڑے دنوں بعد موت ہو گئی۔ وجے نگر سامراجیہ دن بدن کمزور ہونے لگا۔ اور پھر وجے نگر کا ستارہ ڈوب گیا۔

پورندر داس

کرناٹک قدرتی نظاروں میں لاثانی ہے ہی، ادب اور فن میں بھی بے مثال ہے۔ کرناٹک مادھواچاریہ کی جنم بھومی اور شنکراچاریہ، رامانج جیسے مشہور دھرم گوروؤں اور سنتوں کے اس آماجگاہ میں بھکت کوی پورندر داس کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے چار لاکھ سے زیادہ شعر کہے اور انھیں مدھر سُور میں گا گاکر بھگتوں کو مست کیا۔ یہ شعر مختلف راگ راگنیوں میں ہیں اور سنگیت کا بیش قیمت اثاثہ سمجھے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پورندر داس کے گرو شری ویاس تیرتھ تھے۔ دیکشا لینے سے پہلے ان کا نام شری نواس نائک تھا۔ ان کے پتا وردپا ایک بیوپاری تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کا ہی دھندا سنبھالے۔ اسی وقت انھوں نے اپنے لڑکے کی شادی سرسوتی نام کی ایک خوب صورت لڑکی سے کردی۔ شری نواس کچھ سال تک تو گھر گرہستی کا سکھ اٹھاتے رہے، لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن شری نواس کے گھر ایک غریب برہمن کے روپ میں خود بھگوان آئے اور گڑگڑا کر بولے — بیٹا! مجھے اپنے بیٹے کا جنیو کرنا ہے اس لئے تم مجھ غریب کی اس آڑے وقت میں کچھ مدد کرو اور کچھ روپے دے دو۔

سیٹھ شری نواس بہت کنجوس تھے۔ انھوں نے برہمن کو دھتکار دیا۔ وہاں سے نا امید ہو کر برہمن شری نواس کی بیوی کے پاس پہونچا۔ سرسوتی کو اس کی خراب حالت پر

بہت ترس آیا۔ لیکن اُس کے پاس نقد روپے تو تھے نہیں۔ اس لئے اس نے اپنی ناک کی قیمتی نتھ برہمن کو دے دی اور کہا کہ وہ اسے رکھ کر روپیہ حاصل کرلے۔

برہمن وہ نتھ لے کر سیٹھ شری نواس کی دوکان پر گیا اور بولا — سیٹھ جی! کچھ روپے اُدھار دے دیجئے۔

شری نواس نے وہ نتھ اُلٹ پُلٹ کر دیکھی تو ان کے دل میں شک ہوا کہ یہ نتھ تو میری بیوی کا معلوم ہوتا ہے۔ اپنا شک دُور کرنے کے لئے وہ برہمن کو وہیں دوکان پر بٹھا کر جلدی سے گھر پہونچے اور بیوی سے بولے — سرسوتی، تیرا نتھ کہاں ہے؟ ذرا مجھے دکھا۔ کچھ کام ہے۔

سرسوتی اپنے شوہر کی عادت سے واقف تھی۔ ان کو تو بیوی سے بھی زیادہ دمڑی پیاری تھی۔ وہ بےچاری ڈر گئی۔ اور اس نے سوچا کہ بےعزّت ہونے سے تو یہ اچھّا ہے کہ زہر کھا کر جان دے دُوں۔

وہ اپنے کمرے میں گئی اور ایک کٹورے میں زہر گھول کر بھگوان کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو کر ہری نام کا کیرتن کرنے لگی۔ جب اس نے زہر پینے کے لئے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ زہر کی جگہ پیالے میں وہی نتھ پڑی ہوئی تھی۔

اس کا شوہر پیچھے کھڑا ہُوا یہ واقعہ دیکھ چکا تھا۔ وہ نتھ لے کر دوکان پر آیا اور تجوری کھولی تو نہ وہاں برہمن کی دی ہُوئی نتھ ہی تھی اور نہ دوکان پر برہمن دیوتا ہی کہیں دکھائی پڑے۔ اس معجزے نے شری نواس کی آنکھیں کھول دیں۔ اُنھوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ دنیا کا مال و دولت کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل مزہ تو بھگوان سے لو لگا کر جینے میں ہے۔ یہ سوچ کر اپنی ساری دولت غریبوں میں بانٹ دی اور اپنی بیوی اور بچّوں کے ساتھ منی دیاس تیرتھ کے مٹھ میں پہونچے۔ ان کی سچّی لگن دیکھ کر منی دیاس تیرتھ نے انھیں گیان دھیان کی باتیں سکھائیں۔ اور ان کا نام بدل کر پورندر داس رکھ دیا۔

یہیں سے پورندرداس کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ وہ خدا کی یاد میں محو ہو کر روز نئے نئے گیت اور بھجن لکھتے۔ شروع کے کچھ گیت تو انھوں نے اپنی بیوی کی تعریف میں لکھے ہیں کیونکہ ان ہی کے بدولت انھیں گیان حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے مختلف تیرتھ استھانوں اور مذہبی مرکزوں کا دورہ کیا اور اپنے اشعار سے بھگتوں کو مست و بے خود کیا اور ان میں مذہبی جذبات بیدار کئے۔ آخر میں وہ وجے نگر کی راج دھانی ہمپی میں رہنے لگے۔ آج بھی اس راج دھانی کے کھنڈروں میں ان کا منڈپ سر اٹھائے کھڑا ہے۔

پورندرداس کے چار بیٹے تھے۔ یہ چاروں اپنے پتا کے بھگت تھے اور ان کی طرح ہی بھگوان کا کیرتن کرنے میں لگے رہتے تھے۔ پورندرداس نے اپنے گیتوں اور بھجنوں کے ذریعے سنگیت کو عوام میں مقبول بنایا، دنیاوی لالچ کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا اور طبقاتی فرق کو مٹانے کی کوشش کی اور بھگوان پورندر وٹھل کے گن گا گا کر بھگتی کی گنگا بہائی۔

پورندرداس نے اپنے سنگیت میں کرناٹک طرز کو اپنایا ہے۔ اپنے خیالوں کو اُنھوں نے خوب صورت ڈھنگ سے کویتا کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ اس بھگت نے کرشن کی بال لیلا کو بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

پورندرداس صبح سویرے اُٹھ کر تنبورے پر کیرتن کرتے اور اپنی بیوی اور بچوں سمیت دُور دُور جا کر بھجن گاتے ہوئے بھیک مانگتے تھے۔ کروڑپتی سیٹھ شری نواس اب پورندرداس بن کر اب گاؤں میں بھکشا مانگتے پھر رہے ہیں، یہ دیکھ کر گاؤں کے لوگ حیرت کرتے تھے۔ پیسے کا لالچ یا غرور اب ان میں نام کو نہ تھا۔ بھیک میں جو کچھ ملتا اُس سے وہ نہ صرف اپنے خاندان کا ہی پیٹ بھرتے بلکہ اس میں دُوسرے مُصیبت زدوں کو بھی حصّہ دیتے۔

پورندرداس نے اپنے بھگتوں کو پاک اور صاف زندگی گزارنے کا اُپدیش دیا

وہ کہا کرتے تھے کہ اُدھار مت لو۔ لالچ میں مت پڑو۔ قناعت سے کام لو۔ وہ کل کی کبھی فکر نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی سائل ان کے پاس آتا تو کچھ ان کے پاس ہوتا اُسے دے دیتے۔ انھوں نے گھر میں کبھی کچھ جمع نہیں کیا۔ ان کی بے لوثی اور قناعت پسندی نے سب کو موہ لیا تھا۔

پورندر داس مہاراجہ شری کرشن دیو رائے کے ہم عصر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن مہاراجہ صاحب خود پورندر داس کے درشنوں کو آئے اور انھیں اپنے ساتھ محل میں لے گئے۔ بات چیت کے دوران میں کچھ دھن دولت کا ذکر آیا تو پورندر داس نے کہا۔ راجن! سلطنت کی شان و شوکت اور دنیاوی دھن دولت بھگتوں کی شان اور ان کی دولت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تمہاری دولت تو آنی جانی ہے۔ چور اُسے چُرا سکتے ہیں۔ لیکن ہم بھگتوں کی دولت خود بھگوان ہیں۔ ہماری کمائی اس کی عبادت اور ریاضت ہے۔ ہمارے لئے ہری نام ہی سب کچھ ہے۔

کہتے ہیں، پورندر داس کے اس اپدیش کا مہاراج پر بہت اچھا اثر پڑا اور وہ بھی ان کے قدردان بن گئے۔

پورندر داس ایک بڑے سماج سیوک بھی تھے۔ وہ نہ صرف لوگوں کو خدا کی بھگتی اور نیک چلنی کا اُپدیش دیتے تھے بلکہ ان کو ایک مثالی زندگی گزارنے کا ڈھنگ بھی سکھاتے تھے۔ ان کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ دن میں ایک بار گاؤں میں جاکر لوگوں کے سُکھ دُکھ کی بات بھی پوچھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں میں بہت مقبول ہوگئے۔ لوگ ان کی بھجن منڈلی میں بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہونے لگے۔ ان کی عوامی مقبولیت کو ملک کے امن و امان کے لئے خطرہ سمجھ کر حکومت کے کچھ اہل کار انھیں پریشان کرنے لگے۔ لیکن اس سے ان کی مقبولیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔

پورندر داس کے اُپدیشوں سے لوگوں کو بہت شانتی ملتی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو

سمجھایا کہ انکساری کے بغیر علم' بے لوثی کے بغیر دولت اور سچائی کے بغیر ادھیکار کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ انھوں نے سماج سدھار کرنے والوں اور مذہبی پیشواؤں کو للکار کر کہا کہ اپنا طور طریقہ درست کئے بغیر دوسرے کو سدھارنا یا دھرم اپدیش دینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ جب تک کہ انسان کے خیالات اور اس کے اعمالِ صالح نہ ہوں تیرتھ یاترا کرنا اور چندن لگانا سب بے کار ہے۔ گروؤں کی عزت' جنتا کی خدمت اور بھوکوں کو اناج دینا ہی سب سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔

مختلف سنتوں کی طرح پورندرداس سے بھی کچھ معجزے سرزد ہوئے۔ ہندوستان کا سفر کرتے ہوئے وہ ایک بار تروپتی پہونچے۔ وہاں پر انھوں نے سنتوں اور بھگتوں کو ایک بہت بڑی دعوت دی۔ اس موقع پر گھی کی کمی ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ بھگوان اپنے بھگت کی لاج رکھنے کے لئے ایک سنت کے روپ میں وہاں پہونچے اور سب کو خود گھی پروسا۔

ہندوستان کے سفر سے واپس آکر پورندرداس نے اپنے جیون کے باقی دن پورندر گڑھ میں گذارے۔

پورندرداس کے بھجنوں کا اب ہندی میں بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بابو راج کمٹھیکر نے "پورندرداس کے بھجن" نام کی کتاب لکھی ہے۔ جس میں پورندرداس کے بھجنوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ نیچے ان کی کتاب سے لیا گیا ایک بھجن دیا گیا ہے۔

پرارتھنا

میں تجھ سے اور نہ مانگوں گا' میرے
ہردے کمل میں تو ستھر ہورے سوامی
سِر تو چرن میں نت ہو' میرے
نین سدا تجھے دیکھیں شری ہری ہے

کرن تیرے گیت سُن لے، نت
نرمال دھران سیون کرلیں ہری

وانی کو تو یش گانے دیں، میرے
کر دونوں میں تیری سیوا میں رت ہوں
پاد تیرتھ یاترا میں چلیں، میرا
من انودن تیرے سمرن مگن ہو

بُدھی تجھ میں لین ہونے دیں، مگن میرا
چت سدا تجھ میں ستھر ہو رہے سوامی
بھگت جن کا سنگ ہونے دے، سدا
پورندر وِٹھل تو اتنی دیا کر!

تلسی داس

تلسی داس ہندی کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ بہت بڑے بھگت اور شدھار ک (اصلاح کرنے والے) بھی تھے۔ تلسی نے اپنے بھگوان رام کے گنوں (خوبیوں) کا پرچار کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بارے خود کچھ نہیں لکھا ہے لیکن ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں ادھر ادھر بکھری ہوئی باتوں اور ان کے بارے میں مشہور روایتوں سے ان کی زندگی کے واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ ان کی سچائی میں شک بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی پکا ثبوت نہیں ملتا۔

سولھویں صدی کے وسط کی بات ہے۔ اس وقت بھارت میں مغل بادشاہ اکبر راج کرتا تھا۔ باندہ ضلع میں راجا پور نام کا ایک گاؤں تھا۔ اس میں آتما رام نام کا ایک بڑا مذہبی برہمن رہتا تھا۔ ایک دن جب اس کے گھر لڑکا پیدا ہوا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے بچے کا نام رامبولا رکھا۔ یہی رامبولا بڑا ہو کر تلسی داس کہلایا۔

تلسی داس دوسروں کی مدد کرنے والے، آزاد خیال اور بڑے سخی تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا وہ ہمیشہ غریبوں کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار کوئی غریب برہمن اپنی بیٹی کے بیاہ کے لئے تلسی داس کے پاس مدد مانگنے آیا۔ تلسی داس تو پھکڑ آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے دوست اکبری دربار کے امیر اور کوی عبد الرحیم خان خاناں کے پاس بھیج دیا۔ رحیم نے برہمن کو بہت سا روپیہ دیا اور تلسی کے پاس ایک خط لکھ کر بھیجا۔ جس میں اُن کی تعریف میں یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا۔

گود لئے ہلسی پھرے تُلسی سو سوت ہوئے

اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ شاید تلسی داس کی ماں کا نام ہلسی تھا۔ تلسی نے

اپنی کتاب 'کویتاولی' میں لکھا ہے ــــــ

ماتو پتا جگ جائے تجیوں' ودھی ہو نہ لکھی کچھ بھال بھلائی۔ اور'

جایو کل منگن بدھاو نو بجایو سونی

بھیو پریتاپ پاپ جننی جنک کو

یعنی' جنم ہوتے ہی ماتا پتا نے اسے تیاگ دیا۔ بھگوان نے پیدا ہوتے ہی اس کے بھاگیہ میں برائی لکھ دی تھی۔ جنم کے وقت بدھائی اور باجوں کو سن کر ماتا پتا دونوں کو بہت ہی دکھ ہوا بچپن میں انھیں ماں باپ کا سکھ نہیں ملا' اتنا تو طے ہے۔ لیکن ماں باپ نے انھیں کیوں علٰحدہ کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں کئی باتیں مشہور ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا جنم ایک نحس نچھتر میں ہوا تھا۔ اس لئے انھیں منحوس سمجھ کر ماں باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے گرہ کچھ ایسے تھے جس سے پتا کی موت کا خطرہ تھا۔ اس لئے تلسی داس کے پتا نے انھیں چھوڑ دیا۔ کچھ لوگوں کا ایسا بھی خیال ہے کہ جنم کے وقت ان کا بدصورت چہرہ دیکھ کر ان کی ماں ڈر گئیں۔ اور انھیں خاندان کا ناش کرنے والا سمجھ کر اپنی ایک داسی کے ساتھ اس کی سسرال بھیج دیا۔ جہاں ان کے بچپن کے کچھ دن گذرے۔

بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ تلسی کو اپنے ماں باپ کا پیار نہیں ملا اور ان کا بچپن بڑی غریبی میں گذرا۔ کہا جاتا ہے کہ چنیا نام کی داسی نے تلسی کی بڑی محبت سے پرورش کی لیکن بدقسمتی سے پانچ برس کے بعد ہی وہ اس دنیا سے چل بسی اور پانچ برس کا ننھا بچہ تلسی دنیا میں اکیلا رہ گیا۔

گھر گھر بھیک مانگتے ہوئے تلسی پر ایک دن اچانک نرہری شاستری نام کے ایک عالم کی نظر پڑی۔ انھوں نے ان میں چھپی ہوئی صلاحیت کو پہچان لیا اور انھیں اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ شاستری جی نے کچھ دن بعد ایودھیا لے جا کر جنیؤ ڈالنے کی رسم ادا کی

سب لوگوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ تلسی نے بنا کسی کے سکھائے ہی گائتری منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ شاستری نے پانچوں سنسکار کرا کر ان کو رام منتر کی تعلیم دی اور سنسکرت ادب کا مطالعہ کرایا۔

تلسی بڑے تیز تھے۔ وہ گورُو کے پڑھائے ہوئے سارے سبق فوراً سمجھ لیتے اور بہت جلد یاد کر لیتے تھے۔ ان کے گورو ان سے بہت خوش تھے۔ اس کے بعد کاشی میں شیش سناتن جی کے ساتھ رہ کر وہ پندرہ برس تک وید اور پُورانوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

ایک دن اچانک تلسی کا دل اپنے گاؤں جانے کے لئے گھبرانے لگا۔ انھوں نے اپنے گورو سے اجازت لی اور چل پڑے وہاں جا کر اُنھوں نے اپنے گھر کی جو حالت دیکھی اس سے انھیں بڑا دُکھ ہُوا۔ ماں پہلے ہی سُدھار چُکی تھیں۔ پتا کا انتقال بھی کچھ دن پہلے ہو گیا تھا۔ سارا گھر اُجڑا پڑا تھا۔ اُنھوں نے اپنے پتا کا شرادھ کیا اور اُسی گھر کو پھر سے بسا کر رہنے لگے۔ رام کی کتھا سُناتے اور جو کچھ مل جاتا اسی سے اپنا گذارہ کر لیتے۔

تُلسی کے بیاہ کے بارے میں کچھ ٹھیک پتہ نہیں ہے۔ ان کی پتنی رتناولی کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے وہ اس طرح ہے:۔

تلسی اپنی پتنی کو بہت چاہتے تھے۔ وہ اسے اپنی ماں کے گھر تک نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک دن جب تلسی گھر میں نہیں تھے، رتناولی کا بھائی اسے لینے آیا۔ رتناولی میکے کی خواہش کو روک نہ سکی اور شوہر کی اجازت لئے بغیر ہی بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ شام کے وقت جب تلسی لوٹے تب انھیں گھر سُونا ملا۔ پڑوسیوں سے پُوچھنے پر پتہ چلا کہ رتناولی اپنے میکے چلی گئی ہے۔

کرشن پکش کی اندھیری رات تھی اور اس پر برسات کا موسم راستے میں ندی پڑتی تھی۔ جو بارش کی وجہ سے پانی سے لبالب بھری تھی۔ تلسی نے نہ آگے دیکھا نہ پیچھے، بس اُمنڈی ہوئی ندی میں پھاند پڑے اور تیر کر کھٹا کھٹ اس پار پہونچ گئے۔ ان کے کپڑے بھیگے ہوئے لیکن

اُنھیں اس کی فکر نہ تھی۔ وہ اسی حالت میں سسرال جا پہونچے۔ اپنے پتی کو اس حالت میں آتا دیکھ رتناولی کو بہت شرم اور جھنجھلاہٹ ہُوئی۔ اس نے تلسی داس کو یہ میٹھی جھڑکی دی:۔

ایستھ چرمئے دیہہ مم، تا میں ایسی پریتی
ایسی جو شری رام میں ہوت نا تب بھوبھیتی

یعنی، میرے ہڈّی اور چمڑے والے جسم سے جتنا آپ پریم کرتے ہیں اگر اُتنا پریم آپ بھگوان رام سے کریں تو پھر سنسار میں آپ کو کوئی دُکھ نہ ہو۔ کہنا مشکل ہے کہ کتھا میں کتنی سچائی ہے۔ کم سے کم دوہا تو یقیناً تلسی داس کا نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ بیوی کے منھ سے یہ الفاظ سُن کر تلسی کے دل پر بڑی چوٹ لگی۔ اور درویشی و فقیری کا سویا ہُوا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اور وہ فوراً وہاں سے چلے گئے۔ اب انھوں نے رام کی بھگتی میں اپنا دل لگایا اور دنیا کا مایا موہ چھوڑ دیا۔ تب ہی سے وہ بھگوان کا بھجن کرتے ہُوئے تیرتھ استھانوں میں گھُومنے لگے۔

تلسی داس کی زندگی بڑی مُصیبتوں میں گذری تھی۔ وہ خود بچپن میں ہی لاوارث ہو گئے تھے۔ بھیک مانگ کر اُنھوں نے اپنا پیٹ پالا تھا۔ غریبی کی وجہ سے اُنھیں کئی بار بے عزّتی بھی سہنی پڑی تھی۔ سماج میں صرف پیسے والوں کی عزّت تھی۔ لوگ اپنے پیٹ کے لئے اچھے بُرے سبھی طرح کے کام کر گُزرتے تھے۔ بہت سے لوگ اولاد تک بیچ دیتے تھے۔ سماج کے سامنے کسی طرح کوئی اصول نہ تھا۔ پنڈتوں کی دُنیا عام لوگوں کی دُنیا سے الگ تھی۔ بہت سے پنڈتوں نے تلسی داس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن ان باتوں سے وہ نااُمید نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں اُمید اور یقین کا پیغام ملتا ہے۔ ان کے کردار کی تین خاصیت تھیں۔ جس کا اندازہ ان کی نصیحتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت منکسر مزاج اور جذباتی تھے اور رام سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں تلسی سنسکرت میں اپنی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت کے سبھی پنڈت عام طور پر سنسکرت میں لکھتے تھے لیکن عام جنتا سنسکرت نہیں جانتی تھی۔ اس لئے عام لوگوں کی

بھلائی کی خاطر تلسی نے جنتا کی زبان میں اپنی نظمیں لکھیں۔

کاشی سے تلسی ایودھیا چلے گئے اور ۱۵۷۴ء میں رام نومی کے دن انھوں نے اپنے رام چرت مانس کی رچنا شروع کی۔ دو برس سات مہینے اور ۲۶ دنوں میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ تلسی داس کی یہ مشہور عالم تصنیف اودھی زبان میں ہے۔ رام چرت مانس کو لوگ 'راماین' بھی کہتے ہیں۔

تلسی داس کے وقت جنتا میں قسم قسم کے اختلافات اور بھید بھاؤ موجود تھے۔ دھرم کے میدان میں کوئی شو کو پوجتا تھا کوئی وشنو کو۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے۔ اس لئے تلسی نے ان سب کے بیچ امن قائم رکھنے کے لئے ایک ایسا راستہ نکالا جس میں سبھی دیوتا ایک ہی بھگوان کے الگ الگ روپ مانے گئے تھے۔ انھوں نے رام کو بھگوان مان کر ان سے شو کی اپاسنا (پوجا) کروائی، دوسری طرف شو کو رام کا بھگت قرار دیا۔ اس طرح اس جھگڑے کو کافی ٹھنڈا کر دیا۔

تلسی نے ہندو سماج میں جو برائیاں آگئی تھیں اور مذہب کے نام پر جو ظلم کئے جاتے تھے۔ انھیں عوام کے سامنے پیش کیا۔ لوگوں کے دلوں میں بھگوان کے لئے وشواس اور ان میں روحانی طاقت پیدا کی۔ 'رام چرت مانس' کے علاوہ تلسی داس نے کئی دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے کویتاولی، گیتاولی، کرشن گیتاولی، ونے پتریکا وغیرہ۔

تلسی داس سورداس کے زمانے میں ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار دونوں شاعروں کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اس وقت تک سورداس بوڑھے ہو چکے تھے اور بہت کم لکھتے تھے۔ تلسی داس جوان تھے اور اپنا کاویہ شروع کرنے والے تھے۔

تلسی داس کو چترکوٹ، ایودھیا اور کاشی بہت پیارے تھے۔ اپنے آخری دنوں میں تلسی داس کاشی میں تھے۔ وہاں ان کے بازوؤں میں سخت درد ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں کاشی میں ایک بھیانک بیماری پھیلی تھی۔ جو شاید پلیگ کی بیماری تھی۔ اس سے بہت سے لوگ تڑپ تڑپ کر مرنے لگے تھے۔ ۱۶۲۳ء کے شراون کے مہینے میں ان کی موت ہو گئی۔ ان کی موت کے بارے میں یہ دوہا مشہور ہے —

سنوت سورہ سو اسی، اسی گنگ کے تیر
ساون شکلا سپتمی، تُلسی تجیو شریر

لیکن کچھ لوگ اس تاریخ کو صحیح نہیں مانتے۔ اور کہتے ہیں کرشن پکش کی تیج کو ان کی موت ہوئی۔ اس کے ثبوت وہ یہ دوہا پیش کرتے ہیں ــــ

سنوت سورہ سو اسی، اسی گنگ کے تیر
ساون سیاما تیج سنی، تلسی تجے شریر

تُلسی کا لکھا ہؤا یہ پد گاندھی جی کو بہت پسند تھا۔ وہ اپنی پرارتھنا میں اس پد کو گایا کرتے تھے ــــ

دھن پرائے وِش تیں وش بھاری ؛ جنی سم جانا ہیں پرناری
دکھت ہوں ہیں پر بپتی بیسیکھی ؛ جے ہرش ہوں پر سمپتی دیکھی
رتن ہکے من سُبھ سدن تمھارے ؛ جن ہوں رام تم پران پیارے
سوامی سکھا پِتو ماتو گرو، جنکے سب تم تات
من مندر تنہکے بسہو، سیائے سہت دواو بھرات